مٹی کے دکھ

صفیہ حیات

علی میاں پبلی کیشنز
عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور

علینہ، آئمہ اور احمد کے نام!

قبیلۂ کُشتگانِ تیغِ ناز

صفیہ حیات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں ۔ انہوں نے ہر فیلڈ میں خود کو منوایا ہے ۔یعنی افسانہ نگاری ، کالم نگاری ، ناولٹ اور ناول......انہوں نے سب پر طبع آزمائی کی ہے اور کامیاب رہی ہیں ۔

نثر کے ساتھ ساتھ ان کا شعری سفر بھی جاری ہے ۔ان کی اردو اور پنجابی شاعری پُر تاثیر اور قابلِ مطالعہ ہے ۔

قبیلۂ کُشتگانِ تیغِ ناز میں اپنا نام تحریر کروانے کے لئے محترمہ صفیہ حیات صاحبہ نے اپنی خدمات قلبی و قلمی کو معاشرتی ناانصافیوں کے تدارک کے لئے وقف کر دیا ہے اور معاشرتی ناہمواریوں کو سپردِ قلم وقرطاس کرنے کی قابلِ صد ہزار ستائش کاوشِ رندانہ کی ہے ۔

محترمہ کی کتاب ''مٹی کے دُکھ'' میں متنوع عنوانات کے تحت خاص طور پر جہاں کہیں صنفِ نازک کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے ۔ محترمہ کا قلم مرزا غالب کے اس شعر پر عمل پیرا نظر آتا ہے ۔

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

جب جب شمشیرِ ظلم عریاں ہوگی تب تب محترمہ صفیہ حیات کا قلم اس کے خلاف نبرد آزما ہوتا رہے گا ۔

غلام رسول آصف

تخلیقی حوالہ

صفیہ حیات صاحبہ تعلیم و تدریس کے شعبہ سے وابسطہ ہیں ۔ وہ ایک اچھی شاعرہ اور افسانہ نویس ہیں ۔ وہ روزمرہ زندگی میں اپنے ساتھ جیتے جاگتے کئی کرداروں کا سامنا کرتی ہیں ۔ انہیں روز نئے تجربات سے رُوشناس ہونا پڑتا ہے ۔ اور وہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کے اردگرد کئی کہانیاں بکھری پڑی ہیں ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کہانیوں کو سمیٹ کر ایسی شکل دی جائے کہ وہ کہانیاں ایک آواز بن جائیں ۔ لکھنے والے کا سوچنے اور پرکھنے کا انداز دوسروں سے الگ ہوتا ہے ۔ اسی سوچ نے صفیہ حیات صاحبہ کو مجبور کیا اور انہوں نے اپنے اردگرد بکھری ہوئی ایک ایک کہانی کو جمع کرنا شروع کیا تو وہ ''مٹی کے دکھ'' کے نام کی کتاب بن گئی ۔ کئی افسانے قرطاس پر بکھر گئے اور کئی بے زبان کرداروں کو زبان مل گئی ۔

''مٹی کے دکھ'' دراصل زندہ انسانوں کی کہانیاں ہیں ۔ انسان جو مٹی سے تخلیق کیا گیا ۔ وہ دنیا میں کن دکھوں سے دوچار ہے، اور اس کے کیا کیا مسائل ہیں ۔ صفیہ حیات صاحبہ ایک عورت ہیں اور انہوں نے عورتوں کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ۔ انہوں نے ایک بیوی، بہن، ماں اور بیٹی کے دکھ کو ایسے محسوس کیا ہے جیسے وہ اس کردار کی جگہ خود کھڑی ہوں اور وہ اپنا قلم کسی اور کے لئے نہیں بلکہ اپنے آپ پر چلا رہی ہوں اور یوں جس کہانی نے جنم لیا وہ دل سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی، جو کردار انہوں نے پیش کیا وہ ہمیں معاشرے کا زندہ کردار لگا، اور جس محرومی کا انہوں نے ذکر کیا وہ اپنے اندر کی محرومی دکھائی دی ۔ یہی صفیہ حیات صاحبہ کے لکھنے کی خوبصورتی ہے اور یہی ان کا فن ہے کہ انہوں نے بہترین افسانے تخلیق کئے اور ان کا مشاہدہ ہمیں ان کے افسانوں اور کرداروں میں دکھائی دیتا ہے ۔

اچھا افسانہ یہ ہے کہ قاری پڑھنا شروع کرے تو وہ اختتام تک پڑھتا ہی چلا جائے اور اسے لگے کہ یہ کہانی پرائی نہیں ہے ۔ صفیہ حیات صاحبہ نے جہاں افسانہ لکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ افسانہ ہی رہے وہاں انہوں نے یہ مہارت بھی دکھائی ہے کہ کہانی میں دلچسپی کا عنصر بھی کہیں ٹوٹنے نہ پائے ۔

صفیہ حیات صاحبہ کے افسانے پڑھنے کے بعد کئی سوال جنم لیتے ہیں ۔ یہ وہ سوال ہیں جن کا حل اس معاشرے میں بسنے والوں کو ملنا چاہیئے ۔

میری دعا ہے کہ صفیہ حیات صاحبہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''مٹی کے دکھ'' آپ سب کو پسند آئے اور وہ آئندہ بھی اس سے بھی اچھی تخلیقات ہمیں پڑھنے کو دیتی رہیں ۔ اور ان کا قلم چلتا رہے ۔

فاروق انجم

پیش لفظ

میرا قلم اور کتاب سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ کہانیاں پڑھتے پڑھتے میں نے قلم تھام لیا۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے سے آغاز کیا۔ جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔شعور کی سیڑھی پر قدم رکھا تو دھرتی ماں کے دکھ، طبقاتی نظام، اور معاشرتی ناہمواریوں کے پسے ہوئے کردار دکھائی دیئے۔ گرم تپتی دوپہروں میں لوگ تھک کر آرام کرتے ۔ میں قلم تھامے ان کرداروں کی کہانیوں کے تانے بانے بُنتی ۔ پھر میں اپنے کرداروں کی کڑی دھوپ کا سفر، زرد موسم کے زرد گلاب کی داستان سُنتی، کڑھتی اور لکھتی چلی گئی ۔

عشق سے درد جنم لیتا ہے درد سے تخلیق ۔ یوں آتشِ عشق مجھے ہمہ وقت جھلسانے لگی ۔ الُو ہی روشنی سے میرا اندر باہر چمک اٹھا۔ میرے پاس لفظ ہی لفظ تھے ۔ روتے ہنستے، جیتے مرتے کردار میرے سامنے آ بیٹھے ۔ میں ان کی رُوداد سنتی اور لکھ لیتی ۔ ایک کے بعد ایک کہانی اٹھتی چلی جاتی ۔ مسلسل لکھنا مجھے تھکا دیتا مگر سامنے بیٹھی کہانی کے آنسو مجھے سونے نہ دیتے ۔ میرے پاؤں روک لیتے ۔

قلم سے رشتہ کئی برس تک تسلسل سے قائم رہا۔ گھر اور گھر داری کی مصروفیات کے سبب اس تسلسل میں کچھ توقف رہا۔ پھر کالم لکھے ، کالم سے افسانے ۔

''مٹی کے دکھ'' لکھنے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ بہت سے لوگوں کا تعاون میرے ساتھ رہا۔ میرے مرحوم والد'' حیات علی'' جو ہمیشہ میرے لئے دُعا گو رہے میری والدہ، اور میرے بھائیوں خصوصاً شاہد حیات جن کے ہاتھ ہمیشہ میری کامیابی کے لئے اٹھتے ہیں ۔ میری بہنیں، بھابھیاں جو میری سب سے بڑی نقاد ہیں ۔ میرا بھانجا اسامہ اکرم جو میری ہر تحریر پر تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ ہر ادبی محفل میں میرے ساتھ رہا۔

''مٹی کے دُکھ'' یقیناً آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتی اگر میرے جیون ساتھی (عامر شہزاد) کا بھرپور تعاون میرے ساتھ نہ ہوتا ۔ انہوں نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ ان کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی یہ بھرپور خواہش تھی کہ میں اپنی کہانیوں کو کتابی شکل دوں ۔ میں ان تمام لوگوں کی بے حد شکر گزار ہوں ۔ جنہوں نے ''مٹی کے دُکھ'' کی تصنیف میں مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔

میں ادارہ ''علی میاں پبلی کیشنز لاہور'' کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ ''مٹی کے دُکھ'' آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ اسے پڑھئے اس میں کوئی غلطی ہو تو میری کم علمی جان کر نظر انداز کر دیجئے گا۔ مجھے آپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا۔

دعا گو

صفیہ حیات

دیباچہ

محترمہ صفیہ حیات درس وتدریس کے شعبے میں نسلِ نو کی شعوری آبیاری کا فریضہ انجام دے رہی ہیں ۔مختلف ادبی سماجی اداروں سے وابستہ ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بالغ نظر کالم نگار، شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں ۔ان کا یہ فنی سفر لگ بھگ دو دہائیوں کو محیط ہے ۔مختلف اخبارات و رسائل میں ان کی تخلیقات خصوصاً کالم پڑھنے والوں میں نہ صرف یہ کہ مقبول و معروف ہیں بلکہ ان کی علمی ادبی قامت کے تعارف میں بھی انہیں ایک اعتبار اور وقار بخشے ہوئے ہیں ۔

وہ اپنی تخلیق کا مواد اپنے ماحول، سماجی رویے، بنتے مٹتے مناظر، اخلاقیات اور فرد کو درپیش بعض سلگتے ہوئے مسائل سے اخذ کرتی ہیں ۔اس سلسلے میں ان کا سماجی شعور اور تخلیقی صلاحیت ان کے کام کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں کسی بھی چھوٹے سے واقع، تاثر، اور مشاہدے سے وہ ایک بڑی تصویر بنانے کا ہنر جانتی ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی باریک بینی، جزیات نگاری ایک الگ خوبی ہے ۔

''مٹی کا دُکھ'' میں شامل ان کی کہانیوں میں ہم پر عہد جدید کے حوالے سے وہ تمام کڑواہٹیں، تلخیاں بے چینیاں اور فرد سے فرد کی دُوری کے احساسات منکشف ہوتے ہیں ۔

صفیہ حیات کی دردمندی، دوسروں کے دکھ خود پر اوڑھنے مجبوروں، بے کسوں اور بے نواؤں کے آنسو رونے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے ضمن میں اپنی مثال آپ ہے ۔قدرت نے انہیں جس سوز و گداز سے نواز ہے وہ ان کی تحریروں میں تاثیر کی فراوانی کی شکل میں جلوہ گر ہے ۔ان کا اب تک کا یہ فنی سفر ہر حوالے سے مبارک سفر ہے ۔آنے والے دنوں میں ان سے مزید بہتری کی توقعات کی جا سکتی ہیں ۔ہم ان کے روشن مستقبل سے پُر امید ہیں ۔

احمد شہباز خاور

مٹی کے دُکھ

یادوں کے جھروکے سے پہلی یاد کی جھلک سے مجھے اپنی خاموش سی زندگی اور اپنے ہونے کا احساس ہوا۔ چپ کی اوڑھنی اوڑھ کر سیپارہ پڑھنے جانا، پھر سکول، سکول سے گھر، کتابیں پڑھنا......اور پڑھتے ہی جانا۔

نمازوں کا جوش و ولولہ......کبھی مایوسی اندر آ کر ٹھہر جاتی، دُعا کب اور کیسے مانگتے ہیں......؟ پتہ نہ تھا۔ جب اماں کے چہرے پر پریشانی دیکھتی۔ آنکھوں میں آنسو......تو میرا دل کہتا......اماں کو کوئی دکھ ہے۔ تبھی تو مسکراتی نہیں۔ پھر میرے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھتے اماں کا چہرہ مسکرانے لگتا...... مجھے یقین ہو جاتا۔ میری دعا شرفِ قبولیت پا گئی۔

سادہ سی اماں چرخہ کاتتے کاتتے کبھی روتی تو سمجھ نہ آتی انہیں کیا دکھ ہے......؟

مجھے نہیں پتہ تھا عورت کے اندر دُکھ اُگتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے دُکھ......مٹی سے بنے وجود بھی نہیں جانتے......اماں روتے ہوئے کبھی بڑبڑاتی ''مٹی کے دکھ کوئی نہیں جانتا۔ یہ روتی، رُلاتی ہے۔ کبھی مرد کے روپ میں کبھی عورت کے روپ میں یہ بھیس بدلتی ہے۔ کبھی روتی ہے کبھی ہنستی ہے مگر اس کے دکھ کوئی نہیں جان پاتا۔''

میں پوچھتی......

''اماں! بھلا مٹی بھی کوئی روتی ہے......؟''

میں مٹی کے سیب، کیلے، مالٹے بناتی، کبھی ہنڈیا بناتی اور ان کے اوپر رنگ گھول کے اپنی انگلی سے فائنل ٹچ دیتی ہوئی کہتی۔

''یہ مٹی سے بنے میرے کیلے، مالٹے تو کبھی نہیں روتے نہ ان کے دکھ ہیں۔ یہ بس مٹی سے بنے ہیں۔'' اماں مجھے دیکھتی اور ہنس دیتی۔

''اللہ نہ کرے میری بیٹی کو کبھی جو مٹی کے دُکھ دکھائی دیں۔''

میں مٹی سے بنے سب کھلونے دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھ دیتی۔ گیلی مٹی کو گوندھتی۔

اماں! مٹی روتی ہے تو اسے چپ کون کراتا ہے......''مٹی ہی چپ کراتی ہے۔''

اماں مجھے ہاتھ دھو کر سیپارہ پڑھنے کو کہتی۔ میں چپکے سے اندر اُٹھنے والے سوالات کے شور کو خاموش کراتی اُٹھ جاتی۔

اماں بہت خوبصورت تھی، کبھی بناؤ سنگھار نہ کیا۔ پھر بھی خوبصورت دِکھتی تھی۔ اماں سے سوال کرتے جانے کب میری کتابوں سے دوستی ہو گئی۔ ابا کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں، کتاب دوستی نے مجھے اندر باہر سے بدل کر رکھ دیا۔

بارش کچی مٹی پر برستی تو ایسی مہکار پھوٹتی کہ مٹی کی خوشبو اپنے اندر اتارتی سوچتی۔ ''مٹی کو کس نے مہکنا سکھایا......؟ یہ کیوں مہکتی ہے؟ اسے کون کہتا ہے......تم مہکو......اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔''

اماں سے پوچھا......

''مٹی کیوں مہکتی ہے......؟ کون اسے مہکنے کو کہتا ہے؟'' وہ بولیں ۔''پاگل ہوئی ہو......اس سے کس نے کہنا اس کا کام ہے ۔ بارش کے ساتھ خوش ہونا۔اس سے محبت کرنا۔''

میرے سوالات وقت اور عمر کے ساتھ بڑھتے ہی چلے گئے ۔مگر جواب کہیں سے نہ ملتے......سوال میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ، چھپ جاتے......میں جواب ڈھونڈ ہی نہ پاتی......اور ہار جاتی ۔

مطالعہ نے مجھے غور وفکر کی عادت ڈال دی۔کلاس میں ہمیشہ اوّل آتی ۔میں رات بھر پڑھتی ......کبھی نہ تھکتی ۔

شعور کی سیڑھی پر قدم رکھتے رکھتے میں اپنی سہیلیوں سے زیادہ سمجھنے لگی ۔آگے بڑھنے لگی ایسے میں مجھے اپنی ایک ٹیچر سے محبت ہو گئی ۔ ہر وقت اس کو دیکھتی رہتی ۔میرا دل چاہتا میں بھی اِن جیسی بن جاؤں ۔گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو پہلی بار محبت میں بے چینی کا احساس جاگا۔وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ۔ ہر سبق مجھ سے پہلے سنتی ۔جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ہر مضمون از بر ہوتا۔زندگی کا سفر اور طے ہوا۔تو کوئی اور اچھا لگنے لگا۔ یہ کیفیت بھی برقرار نہ رہی ۔

محبت میرے وجود میں سے گزر کر یہ کہتے ہوئے چلی گئی کہ پھر آؤں گی ۔ پھر یہ ہوتا جیسے ہی کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس ہوتی میں دیکھتی تو منظر غائب ہو جاتا......نارسائی کا کرب دکھ کے بعد دکھ میرے اندر اُگا تا چلا گیا۔

کالج میں داخلہ ہوا تو کچھ شوخ وچنچل سہیلیوں کا ساتھ میسر ہوا۔کالج کی ہر نصابی اور غیر نصابی سرگرمی میں مجھے کھینچ لیا جاتا۔

ایک بار کالج میں بین المذاہب مذاکرہ تھا۔مسلم ،کرسچین اور ہندو سکالر مہمانِ خصوصی تھے ۔ میں نے کالج کی طرف سے ایک تقریر''مذہب اور امن'' کے موضوع پہ کی ۔سب نے میرے دلائل کو بہت سراہا۔ایک ہندو پنڈت بھی تھے انہوں نے مجھے تعریفی سند جب تھمائی تو شاباش دیتے ہوئے کہا۔''زبان میں تاثیر ہے مقدر میں ملاپ نہیں ۔'' مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

زندگی برق رفتاری سے سفر طے کرنے لگی ۔میری منگنی ہوئی ٹوٹ گئی...... چند سال گزرے چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوا......مگر شہروز اپنی آفس کولیگ کو پسند کرتا تھا۔اس نے مجھے طلاق دے دی۔

اماں ،ابا پریشان تھے اتنی تعلیم یافتہ بیٹی کے ساتھ ناکامی کا لفظ ذرا نہ بھاتا ۔

مجھے کسی اللہ والے کے پاس لے جایا گیا......اللہ کے ولی نے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور کہا......''مالک نے زبان کی تاثیر عطا کی ہے۔اس کو کام میں لاؤ۔دُکھی انسان کو دعا کی ضرورت ہے......اللہ کوئی بڑی خدمت لینا چاہتا ہے۔خدمت میں غیر حاضری نہ ہو۔

جو سوالی بن کر آئے اس کی جھولی میں دُعا ڈال دیا کر۔انہوں نے اپنے کھائے ہوئے سالن میں سے کچھ مجھے دے دیا۔مٹی کے پیالے میں پینے کو پانی دیا اور لوٹ جانے کو کہا۔

ہم گھر لوٹ آئے ایک دن خالہ حاجرہ جو ہمارے محلے میں رہتی ہیں ،آئیں بولیں......

''بیٹی عائشہ میری ٹانگ میں بہت درد ہے ۔ میں رات بھر بے چین رہی ۔تہجد کے وقت ذرا سی آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہوں تم نے میری ٹانگ پر دم کیا ہے اور دُعا کی ۔ پھر کہا...... خالہ جاؤ اب کبھی یہ تکلیف نہیں ہوگی ۔اب خالہ حاجرہ بضد تھیں کہ میں کچھ پڑھ کر پھونک دوں اور دُعا کر دوں ۔

میں نے بصد اصرار ایسا کر دیا اور یوں محلے سے ہوتی سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی ہمارے دروازے پر ہر وقت کوئی نہ کوئی دعا کروانے آجاتا۔میں کبھی تھک جاتی تو بابا جی کے کہے الفاظ بازگشت بن جاتے ۔ مجھے ایک ہی آواز سنائی دیتی ۔

''زبان میں تاثیر ہے کسی سوالی کو خالی نہ لوٹانا۔'' زندگی کے اس موڑ پر میں نے جانا۔ اللہ تعالیٰ نے جس سے جو کام لینا ہوتا ہے۔ لے لیتا ہے دشوار گزار راستے سے گزار کر، دل کی توڑ پھوڑ اور امتحانات کے بعد گوہر بنا کر روشنی کا کام لیتا ہے۔
اس نے مجھے اس قابل بنا دیا کہ دُکھی انسانیت کی خدمت کروں۔ جب منگنی ٹوٹی، شادی ختم ہوئی۔ میں سوچتی مجھ سے انجانے میں کیا گناہ ہو گیا۔ جو میرا گھر نہیں بستا۔ میں کیوں ناکام و نامراد ہوں۔
میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔ خالہ حاجرہ کی ایک سہیلی جس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ سب اسے بوا کہتے تھے۔ وہ اماں ابا کے مرنے پر میرے پاس آ گئی۔ جس کی حاجت پوری ہو جاتی۔ اپنی خوشی سے جو چاہتا دے جاتا۔ مجھے تو اب ہر طرف اللہ ہی اللہ دکھائی دیتا۔ بوا سب کی چائے پانی کا خیال رکھتیں۔ خالہ حاجرہ بھی زیادہ وقت میرے پاس ہی رہتی۔ یوں دن بھر عورتوں کا میلہ لگا رہتا۔
چولہا گرم رہتا، چائے بھی بنتی رہتی۔ رزق کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ سب کیسے ہوتا مجھے کچھ نہیں پتہ۔ کسی کا شکرانے کے طور پر لایا ہوا کوئی تحفہ، سوغات کسی کی ضرورت بن جاتی۔ ضرورت مند بھی آ جاتا، میں ذاتی طور پر کچھ نہ لیتی۔ پھر بھی کوئی کمی نہ تھی۔
اب میں نے جانا مٹی کے کتنے دُکھ تھے...... تا قیامت رہیں گے۔ مٹی ہی مٹی کے دکھ سمجھتی ہے، سنتی ہے۔ اس کی دعا سے سب غم، تکلیف دور بھی ہو جاتی ہے۔ بس زبان اور الفاظ میں تاثیر گھل جائے۔ دل اور زبان کی آواز ایک ہو جائے۔
بچپن کے سوالوں کے جواب سب مل گئے۔ پردے اٹھتے چلے گئے، میں عائشہ سے بی بی عائشہ بن گئی۔
ایک دن محلے کی باجی ذکیہ کے ساتھ الٹرا ماڈرن خاتون آئی، بہت خوبصورت، ریشم جیسے بال اس کے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ بات کرتی تو دائیں گال پر گڑھا پڑ جاتا۔ مسکراتی تو آنکھیں اداس اور چہرے پر کرب کے آثار دکھائی پڑتے۔
وہ میرے ہاتھ چھو کر بولی۔
''میرا نام عشنا ہے۔ مجھے آپ سے تنہائی میں بات کرنی ہے۔ میں لاہور سے آئی ہوں آپ کے بارے سنا تو ایک سال ہونے کو ہے۔ میں روز ارادہ باندھتی آنے کا...... مگر نہیں آ سکی۔ یونہی سال گزر گیا۔ کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں تھی۔'' جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تبھی قدم اٹھتے ہیں۔ کس سے کب ملنا ہے۔ سب اس کے حکم سے ہوتا ہے۔'' میں عشنا کو ساتھ لئے اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔
ذکیہ کا بہنوئی عشنا کا ڈرائیور تھا۔ وہ ہی اسے لایا تھا۔
میں نے بوا کو اسٹرابیری شیک بنانے اور دوپہر کے کھانے پر اہتمام کرنے کو کہا۔
یوں تو دوپہر کو کھانا ہر روز بنتا مگر دوسرے شہر سے آنے والوں کے لئے میں میٹھا ضرور بنواتی۔ میٹھے میں زیادہ تر سوجی کا حلوہ یا کھیر ہوتی۔
عشنا کو آرام سے بیٹھنے کو کہا کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ اس نے چائے پیتے ہوئے جھجکتے ہوئے کہا۔
''میری کہانی سن کر شاید آپ مجھے اچھے کردار کی نہ سمجھیں مگر میری التجا ہے کہ آپ یہ ضرور یقین کر لیں کہ مجھے خود پہ کوئی اختیار نہیں ہے۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب تھے۔ اس نے گلاس منہ کو لگا لیا تا کہ میں اس کے آنسو دیکھ نہ سکوں۔
ہم دونوں نے ایک ساتھ ملک شیک ختم کیا، گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ بولی۔
''میرے میاں کا اپنا بزنس ہے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، دو بیٹے ہیں۔ اولیول کر رہے ہیں۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ کہنے کو میں بہت سکھی ہوں...... مگر ان سب کے باوجود میں خوش نہیں۔ دو سال پہلے تک ہم میاں بیوی خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ ہر

سال گرمیوں میں شمالی علاقہ جات کی سیر کو جاتے......زندگی بہت خوبصورت تھی۔ پھر جانے کیا ہوا......کس کی نظر لگ گئی۔

اپریل مئی کے دن تھے۔سردی کب کی رخصت ہوچکی تھی۔گرمی کا آغاز تھا۔سورج کی تپش میں ہرروز اضافہ ہورہا تھا۔عجیب اداس سے دن تھے۔میں بیزارسی رہتی۔کوئی کام کرنے کو جی چاہتا نہ کہیں جانے کو۔

میں کہیں جانے کو تیار ہوتی پھرارادہ توڑ دیتی، دن بھرکئی پروگرام بناتی۔ملتوی کرتی اس دن میں بہت ہی سُست اور کسلمندی محسوس کررہی تھی۔میرا کہیں جانے کا موڈ نہ تھا۔میرے میاں عادل بہروز نےفون کیا۔آج شام شیخ ریاض صاحب کے ہاں پارٹی ہے۔تم تیار رہنا۔میں نے انکار کرنا چاہا۔میاں کا موڈ خراب ہونے کا خدشہ تھا۔

میں بڑی بے دلی سے تیار ہوئی......اسکن کلر کے سادہ سے سوٹ کے ساتھ براؤن لپ اسٹک لگائی۔بال ایک کیچر میں باندھے اور عادل بہروز کے ساتھ ریاض لاج کے ہاں آ گئی، پارٹی کا انتظام لان میں تھا۔آج پہلی بارایسا ہوا تھا۔میرا دل بے زار سا تھا،مسز ریاض آگے بڑھ کرملی تو میں نے بھی زبردستی مسکراہٹ ان کی طرف اُچھالی۔وہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے کسی اور سے ملنے چل دی، میرا دل اداس تھا۔میں ایک کونے میں جگہ بنا کر بیٹھ گئی، عادل نے ایک دوبار کہا بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔میں نے ہنس کرٹال دیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جا کھڑے ہوئے...... پارٹیز میں آنا جانا ہمارے لئے معمول کی بات تھی......آئے روز Get To Gether ہوتی تھیں۔اس دن مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔میرے دل کو کیا ہوا...... مجھے یوں لگتا جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو......کچھ مختلف شاید بہت ہی عجیب......میں انہی سوچوں میں گھری بیٹھی تھی کہ ایک نوجوان میری طرف بڑھا......اس کا جسم قدرے فربہی مائل تھا مگر اس کی آنکھوں میں بہت کشش تھی......وہ میرے پاس آ بیٹھا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

''تم کب آئی......؟ یار بتایا ہی نہیں اپنی آمد کی اطلاع تو دی ہوتی۔ہم تو سمجھتے تھے تم مرکھپ گئی ہوگی......مگرتم تو ذرا بھی نہیں بدلی۔بس ذرا اداس بلبل بن گئی ہو......''

میں حیران پریشان اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''اوہو بڑے نخرے ہو گئے......امریکہ میں رہ کرتو مزاج ہی بگڑ گیا تمہارا......'' وہ میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔

میں ہمت کر کے بولی۔'' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔میں آپ کو نہیں جانتی۔'' وہ اچھا کو لمبا کر کے بولا۔

''اچھا اب ہم کون ہو گئے......دن رات دعائیں کرتا پھرتا ہوں تمہاری زندگی کے لئے......اور تم ہو کہ پہچاننے سے مُنکر ہو...... میں خودغرض نہیں۔دبئی جا کر نہیں بھولا......ابھی پرسوں ہی لوٹا ہوں۔اب تنگ نہ کرو یار!'' وہ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے بولا۔وہ مجھے بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

اس نے جیسے ہی پانی کا گلاس لبوں کو لگایا میں نے موقع غنیمت جانا اور کہا۔''میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''یہاں کوئی بھی وہ نہیں جو دکھائی دیتا ہے جو ہماری سوچ کے مطابق ہو......نہ میں، نہ آپ اور نہ کوئی اور......'' وہ گلاس واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھئے مسٹر میں مسز عادل بہروز ہوں نہ میں آپ کو جانتی ہوں نہ آپ مجھے......میں تو پہلی بار آپ سے مل رہی ہوں۔آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

میں نے تیز تیز بولتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

مجھے اب کوفت ہونے لگی تھی۔

ایک گھنٹہ بعد میں نے بوا کو چائے بنانے کو کہا۔ بوا چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو عشنا خاموش ہو گئی۔

بوا چائے بنانے لگی......

''بیگم صاحبہ کتنی چینی......؟'' بوا نے چینی کپ میں ڈالنے سے پہلے مقدار پوچھ لینا بہتر سمجھا۔

''آدھا چمچ۔'' عشنا نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بوا نے چائے بنا کر ہمارے سامنے رکھی۔ دیگر لوازمات والی ٹرالی کھسکا کر آگے کر دی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ بوا کے لئے یہ معمول کی بات تھی۔ دن میں کئی بار ایسی خواتین جو اپنے مسائل سب کے سامنے کہہ نہیں پاتی تھیں، انہیں میں اپنے کمرے لے آتی تھی، راز داری برتتی تھی۔

عشنا نے چائے کا کپ منہ کو لگایا۔ میں نے بسکٹ کی پلیٹ آگے بڑھائی۔ تو اس نے ایک بسکٹ اٹھایا اور شکریہ کہہ کر بسکٹ توڑا۔

بہت خاموشی میں چائے پی گئی۔

اس نے سلسلۂ گفتگو وہیں سے جوڑا۔

اتنے میں مسز ریاض میرے پاس چلی آئیں۔ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''شموئیل یہ مسز عادل ہیں۔''

میں جو جلی بھنی بیٹھی تھی کہا۔ ''اب یقین آ گیا۔ میں وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔''

''اوہو...... ہا! میں تو انہیں اپنی کلاس فیلو جویا سمجھا تھا۔'' وہ اب شرمندہ سا تھا۔

مسز ریاض بولیں۔ ''جویا کی تو پچھلے سال death ہو گئی۔ تمہیں نہیں پتہ چلا......؟''

وہ کبھی مجھے اور کبھی اپنی آپا کو دیکھ رہا تھا۔ مسز ریاض اس کی بڑی آپا تھیں۔ شموئیل کئی سال بعد وطن لوٹا تھا۔ مسز ریاض نے بھی جویا کو نہیں دیکھا تھا۔ جویا کے کسی بھائی بہن نے اس کے مرنے کے دو ماہ بعد فون کر کے بتایا تھا کہ جویا شموئیل کی کلاس فیلو تھی...... وہ مر گئی ہے۔ شموئیل کو اطلاع کر دیں۔

بقول مسز ریاض کے ''مجھے یاد ہی نہ رہا'' شموئیل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا......

''Really Sorry'' مجھے مخاطب کر کے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہ دیا۔ Dinner کے بعد ہم بھی سب سے مل کر گھر لوٹ آئے۔

دو دن سے بارش بغیر وقفہ کے ہو رہی تھی...... رم جھم گہرے چھائے بادلوں نے ماحول کو سوگوار بنا دیا تھا۔

بچے سکول اور عادل آفس جا چکے تھے۔ میں ابھی تک بستر میں تھی دل نہیں چاہ رہا تھا اٹھنے کو...... موبائل کی بپ بجی تو مجھے ناچار اٹھنا پڑا۔ میرا سیل دور کرسی پر پڑا تھا۔ میں نے ناگواری سے اٹھایا۔

''ہیلو'' کہا۔

دوسری طرف ایک انجانی آواز تھی۔

''مسز عادل! میں شموئیل۔ آپا مسز ریاض کے ہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔''

میں نے پہچانتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں مجھے یاد ہے۔ آپ زبردستی مجھے جویا بنانے پر تُلے تھے۔''

''میں شرمندہ ہوں۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''جی کہیے کیسے فون کیا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں کافی دنوں سے چاہ رہا تھا۔آپ سے بات کروں ۔ڈر لگتا تھا۔آپ برا نہ مان جائیں ۔ جویا اور آپ میں مشابہت ہے۔ جویا میری بہت اچھی دوست، کلاس فیلو تھی ۔اس کی Death کا مجھے بہت صدمہ ہے۔کل اس کی تصویریں دیکھ رہا تھا بے اختیار دل چاہا کہ میں آپ سے جویا کی باتیں کروں ۔مسز عادل پلیز مجھے غلط نہ سمجھنا۔ یہاں میرا کوئی دوست نہیں کبھی سارا شہر لاہور اپنا تھا۔مگر آج پتہ نہیں سب کہاں چلے گئے......''

اس نے تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔

میں اب بستر سے چونکہ نکل آئی تھی ۔سونے کا دوبارہ موڈ نہ تھا۔ بہت غور سے اس کی باتیں سنیں۔

پھر جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔''آپ آنا چاہیں تو آجائیں ۔11 بجے تک''۔

''oh, Thank you''میں ٹھیک 11 بجے آپ کے پاس ہوں گا۔اچھی سی چائے پلوایئے گا۔''

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے شموئیل ڈرائنگ روم میں بیٹھا میرے ساتھ چائے پی رہا تھا مگر آج وہ بہت اداس ،مرجھایا ہوا تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ مجھے جویا کی پسند ناپسند بتا رہا تھا۔وہ کھویا کھویا سا اس کے بارے میں بولتا ہوا بہت دُکھی لگا۔میرے دل میں بے اختیار اس کے لئے رحم کے جذبات پیدا ہوئے۔

''شموئیل کیا آپ جویا سے محبت کرتے تھے یا صرف دوستی کی حد تک تھا۔''میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا ہم جب اکٹھے تھے،ساتھ ساتھ رہے۔ بہت لڑتے تھے پھر وہ مجھے منا لیتی اور ہم تھوڑی دیر بعد پھر اکٹھے بیٹھے ہوتے۔ جویا بہت اداس اور ہر ایک سے محبت کرنے والی تھی۔ وہ کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوتی تھی ۔نہ ہی لڑائی میں پہل کرتی۔ میں بلاوجہ ناراض بھی ہوتا اور لڑتا بھی۔کبھی کبھی اس سے پوچھتا۔

''جویا تم کبھی مجھ سے کسی بات پہ خفگی کا اظہار نہیں کرتی......؟''

وہ کہتی۔''میں ایک ہی بار ناراض ہوں گی......پھر تم مجھے منا نہیں سکو گے۔''

''مسز عادل! وہ آپ جیسی تھی مگر اس کے چہرے پر زردی تھی ۔ یوں لگتا تھا۔اس کی زندگی قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے۔ میں نے ایک دوبار اسے کہا بھی۔''تم بیمار لگتی ہو ڈاکٹر سے چیک اپ کیوں نہیں کروا لیتی۔''

وہ ہنس کر کہتی۔''شموئیل کتنا اچھے لگے گا جب میں مر جاؤں گی اور تم روؤ گے۔''

میں نے کہا۔''اوہو اس خوش فہمی میں نہ رہو تم مرو......اور میں اپنے آنسو ضائع کروں گا......؟ ایسا نہیں ہوگا۔''

وہ چپ سی ہوگئی پھر بولی۔''ایک تم ہی تو ہو جس نے مجھے یاد کرنا اور رونا ہے۔''

وہ اکثر ایسی باتیں کرتی۔ یونیورسٹی کے دن سے ہی ہماری دوستی ہوگئی۔اسے Department نہیں مل رہا تھا۔مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا۔

''آیئے میں بھی MBA کا سٹوڈنٹ ہوں ۔ادھر ہی جا رہا ہوں۔''یوں پہلے دن ہم اکٹھے کلاس میں داخل ہوئے تو سب کلاس فیلوز ہمیں کزن سمجھے۔ہم سارا دن اکٹھے رہتے۔کینٹین ،لائبریری کہیں بھی جانا ہوتا......ساتھ ساتھ جاتے۔ وہ میرے بغیر کہیں نہ جاتی

-

وہ بہت اچھی لڑکی تھی بہت خاص......اس میں عام لڑکیوں جیسی کوئی بات نہ تھی......اسے ہر کوئی اچھا لگتا...... ہر ایک کی تعریف کرتی۔کسی کو پریشان دیکھ کر رو پڑتی ۔ایک بار کینٹین کے ویٹر کی بیوی فوت ہوگئی۔وہ کئی دن بعد آیا تو اس کے پاس افسوس کرنے بیٹھ گئی

اور گھنٹوں اس کی مرحومہ بیوی کی باتیں سنتی رہی۔ مجھے بھی چاروناچار بیٹھنا پڑا......وہاں سے اٹھتے ہوئے میں نے اس سے سرگوشی میں کہا۔

''اب تم کیا اس کی مرحومہ بیوی کی جگہ لینے کا ارادہ رکھتی ہو۔'' اس نے غصہ سے گھورا اور بولی۔

''شموئیل تم بہت ہی پتھر دل ہو۔تم نے دیکھا نہیں وہ کتنا دُکھی تھا۔ وہ ہر روز ہمیں چائے پلاتا ہے کیا ہم اس کا دُکھ بھی نہیں سن سکتے۔''

میں نے لاپروائی سے کہا۔''یار اب اتنا بھی کیا دو چار جملوں میں افسوس کروا اور اٹھ جاؤ۔تم تو بس اٹھتی ہی نہیں۔''

ایسے کئی بار ہوتا میں اس کی جذباتیت سے تنگ آجاتا تھا۔ پھر سوچتا۔''جویا جیسے لوگ تو اب ناپید ہیں۔اب تو کوئی کسی کے لئے اچھا نہیں سوچتا۔ پیسے کی دوڑ نے سب کو ہلکان کر دیا ہے۔ ہر کوئی اپنا فائدہ سوچتا ہے اور...... جویا جیسی لڑکی کیسے اس معاشرے میں Survive کرے گی۔

ایک دن مجھے کہنے لگی۔

''شموئیل آؤ کہیں چلتے ہیں......؟''

میں نے پوچھا۔ کہاں......؟

وہ بولی۔''کہیں بھی بہت سی باتیں کرتے ہیں۔ میں تمہیں آج اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گی۔''

وہ اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔''تمہارا دل نہیں چاہتا میرے بارے جاننے کو......؟'' میں نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم ایک لڑکی ہو......بس عام سی۔جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں خبطی سی، دیوانی سی۔اس سے زیادہ جان کر کیا کروں گا۔''

''چلو آج پھر آوارہ گردی کرتے ہیں۔تم بھی کیا یاد کرو گی، کیا اچھا دوست ملا۔''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کلاس روم جانے کے بجائے یونیورسٹی گیٹ سے باہر نکل آئے۔

اس دن ہم نے ایک ریسٹورنٹ سے لنچ کیا۔ بہت کچھ Share کیا۔کھانے کے بعد میں نے چائے کا آرڈر کیا۔ وہ چائے نہیں پیتی تھی۔ جب تک چائے آئی اس نے بتایا''شموئیل میں اپنے مما پاپا کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے ہوں۔ مجھے کچھ نہیں پتہ۔سب کے خونی رشتے ہوتے ہیں۔بہن بھائی، ماموں، خالہ مگر میرا کوئی نہیں۔''

وہ بہت سنجیدگی سے بتا رہی تھی۔ لہجہ دُکھی تھا۔ میں بھی آزردہ ہو گیا۔مگر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔''اس میں انوکھی بات کیا ہے۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔''

''شموئیل میری بات دھیان سے سنو۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اسے روتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی اسے کیسے حوصلہ دوں، چپ کراؤں۔

شاید وہ رونا چاہتی تھی۔اسی لئے مجھے یونیورسٹی سے لے کر آئی، وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہتے کہتے بھول جاتی، ناک صاف کرتے ہوئے بولی۔

''تم کو اس لئے سب بتا رہی ہوں اگر میرے بعد پتہ چلے گا تو جانے کیا غلط سمجھو۔ میں دوستی میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔

میری چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہوگئی تھی، میں اب واقعی پریشان ہوگیا تھا۔ میں نے اماں، بابا سے جویا کے لئے بات کی تھی۔ بابا تو مان گئے مگر اماں نے کہا۔ پتہ نہیں اس کا خاندان کیسا ہے؟ دراصل اماں خالہ کی بیٹی زارا کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔
اب جب جویا نے اپنے بارے میں بتایا تو چند لمحوں کے لئے زمین میرے پیروں تلے سرک گئی۔ اب تو اماں کے راضی ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ میں جویا کا حوصلہ بھی توڑنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پھول جیسا ہو گیا تھا۔
وہ پھر بولی۔
''شموئیل مجھے مما، پاپا نے کہاں سے لیا مجھے کچھ نہیں پتہ۔ میرے چھوٹے بہن بھائی سلویٰ اور شامی دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جس دن سے یہ بات open ہوئی ہے تب سے تو وہ میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا میں بھی اپنی حقیقت سے آگاہ ہوں۔''
میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں غلط فہمی بھی تو ہوسکتی ہے۔؟''
آنکھوں میں لرزتے آنسو ٹشو میں جذب کرتے ہوئے بولی۔ ''نہیں غلط فہمی نہیں میں نے خود سنا ہے۔''
''نینا پھوپھو نے اپنے بیٹے کے لئے سلویٰ کا رشتہ مانگا، بابا بولے۔
''جویا بڑی ہے پہلے جویا کا سوچوں گا۔ پھر سلویٰ کا۔'' پھوپھو نے بڑے کھردرے لہجہ میں کہا۔
''بھائی جان! جویا کس ماں کی بیٹی ہے، کیسا خاندان ہے، میں ساری زندگی کس کس کے سوالوں کا جواب دوں گی۔ آپ نے تو بیٹی بنالی، پالا پوسا لیکن آپ کا خون تو نہیں۔ سلویٰ کے لئے جب آپ کہیں گے میں راضی ہوں۔'' پاپا بہت غصہ ہوئے۔ پھوپھو سے اب بھی ناراض ہیں۔ انہوں نے کہا۔
''پھوپھو کے لیے میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ وہ میرے گھر قدم نہ رکھے۔ اس نے میری جویا کو ایسا کیوں کہا۔ تربیت تو میں نے کی ہے۔ میری تربیت پہ بھروسہ نہیں۔ جویا نہیں تو سلویٰ بھی نہیں۔''
''شموئیل میں پھوپھو کو سلام کرنے کی غرض سے ڈرائنگ روم تک گئی تھی۔ وہیں سے پلٹ آئی۔ میں سو نہیں سکی پچھلی دو راتوں سے......میری وجہ سے مما پاپا بھی پریشان ہیں۔
میں ان کی محبت کا قرض کیسے چکاؤں......؟ انہوں نے تو پالا ہی نہیں بیٹی بھی سمجھا۔ پاپا تو سلویٰ سے زیادہ مجھے چاہتے ہیں۔ مما بھی ہر چیز پہلے مجھے پھر سلویٰ کو دیتی ہیں۔ شامی اکثر حسرت سے کہتا۔
''پاپا! میں سوتیلا ہوں......؟ کاش میں جویا کی جگہ ہوتا۔''
پاپا اُسے گھورتے تو میں اور سلویٰ پاپا کے بازوؤں میں گھس جاتیں اُسے چڑاتیں۔''
وہ روتی جا رہی تھی اور کھوئی کھوئی سی بولتی رہی۔ میں حوصلہ دینے کے لئے منہ کھولتا تو الفاظ ساتھ نہ دیتے۔ وہ پھر کوئی بات یاد آنے پر سنانے لگتی۔
اس دن وہ بہت ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی۔ لائٹ لیمن کلر کے سوٹ میں اونچی پونی ٹیل بنائے پیلا پھول لگ رہی تھی۔
اچانک فیصلہ کن لہجے میں وہ بولی۔
''شموئیل اگر میں مر جاؤں تو پھر مما پاپا کو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ میری حقیقت سب جانتے ہیں، میرے ہوتے ہوئے پاپا سلویٰ کا سوچیں گے بھی نہیں۔ پھوپھو کی فیملی گرین کارڈ ہولڈر ہے۔ سلویٰ کے لئے بہت اچھا رشتہ ہے یہ، اس سے اچھا کچھ سلویٰ کے لئے نہیں

ہوسکتا۔

جب میں نہیں ہوں گی تو پھر مسئلہ کیسا؟ ہے نا......؟ بات کرتے کرتے اس نے چٹکی بجائی اور بولی۔

یہ مسئلہ کا حل اچھا ہے......؟

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''غلط بالکل غلط...... پاگل ہو بالکل تم۔''

''مسز عادل! میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکا۔ جویا میں تو تمہیں جانتا ہوں سب سے زیادہ...... ہر ایک سے زیادہ میں ہوں نا...... تمہیں مرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔'' یہ کہہ ہی نہ پایا۔ میں وہ کہہ نہ سکا جو وہ سننا چاہتی تھی۔''

اُس دن میں نے کھوکھلے انداز میں اسے ہمت دلائی۔ وہ ڈیفنس کی طرف مڑ گئی تو میں لوٹ آیا۔

سڑک پر پڑے پتھروں، پتوں کو میں ٹھوکر مارتا رہا۔ اندر کی بے چینی کو نظر انداز کرتا رہا۔ مجھے بار بار اس کا بھیگا بھیگا چہرہ یاد آتا۔ تواتر سے آنسوؤں کا بہنا، ٹشو سے ناک صاف کرنا۔ شوں شوں کرتے پانی کا گلاس منہ کو لگانا۔ جب وہ سسک کر روئی تو اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

اس کی پونی ٹیل ہلتی رہی۔ وہ اپنی ہر بات کے آخر میں میری طرف پُر امید نظروں سے دیکھتی رہی۔

میں بزدل، ڈرپوک بنا رہا، اندر سے لرزتا رہا۔ اماں کے انکار کے خوف کے زیر اثر رہا۔

میں جو خود کو بہت بہادر، دلیر سمجھتا تھا۔ اس دن معلوم ہوا میں کیا ہوں...... بزدل...... بہادر...... یا مجھے اس سے محبت ہی نہ تھی۔

مسز عادل وہ بالکل آپ جیسی تھی۔

فائنل ایگزام کے بعد اچانک ہی بابا نے مجھے اپنے ساتھ دبئی جانے کو کہا۔ سب پیپرز تیار ہو گئے۔ میں بہت ہی مصروف ہو گیا۔ جاتے سمے اُس سے بات نہ کر سکا۔ نہ الوداع کہا نہ کوئی وعدہ...... چپکے سے چلا گیا۔ میں واپس آیا مگر اس سے کوئی رابطہ نہ کیا...... پتہ چلا وہ بھی امریکہ چلی گئی۔

میں آتا رہا، جاتا رہا۔ اماں شادی کا کہتی میں ٹال دیتا۔

''اگلی بار سہی۔'' وقت برق رفتاری سے گزرا۔ میں یادوں پر پڑی وقت کی دُھول اس لئے بھی صاف نہ کرتا۔ کہیں مجھے اپنا اصل چہرہ دکھائی نہ دے۔

ابھی پچھلے دنوں میں اس کے بھائی سے ملا ہوں۔ اس نے بتایا جویا کو کینسر تھا۔ وہ جانتی تھی مگر اس نے کسی کو نہ بتایا۔ مما پاپا جب بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کی بات کرتے وہ ٹال مٹول کر دیتی۔ پھر خود ہی ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ ہمیں مطمئن کر دیتی میں میڈیسن لے رہی ہوں۔

نومبر کا آغاز تھا۔ سارا دن سورج اور بادل آنکھ مچولی کھیلتے۔ رات کو سخت سردی ہو جاتی وہ اکثر شام کو ٹیرس میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی۔ گیٹ کی طرف دیکھتی رہتی۔ جیسے کسی کا انتظار ہو۔

میں پاس جا کر بیٹھتا تو کہتی۔ ''شامی! کیا تم واقعی مجھے بڑی بہن سمجھتے ہو؟''

''میں جب مما کے ساتھ کھڑی ہوں تو ان کی بیٹی لگتی ہوں۔ کیا میں پاپا جیسی بھی دِکھتی ہوں......؟'' میں ہنستا رہتا۔

''تم کیسی باتیں کرتی ہو، ان کی بیٹی ہو تو ان جیسی ہی دکھائی دو گی۔''

پھر کہتی۔

''شامی میرے بھائی! تم جھوٹ کتنا اچھا بول لیتے ہو......''

3 نومبر کی رات اس کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔اس نے روتے ہوئے کہا تھا۔

شامی! شموئیل ملے تو اُسے کہنا کبھی کبھی کسی کا دل رکھنے کو کہہ دیتے ہیں۔

''میں ہوں نا۔تم کیوں روتی ہو......؟''

پھر وہ چلی گئی ہمیشہ کے لئے۔

وہ سچ کہتی تھی۔

جسے تم پاگل لڑکی کہتے ہو۔

بہت یاد کرو گے۔

رویا کرو گے۔سب سے زیادہ۔

وہ عام سی لڑکی نہ تھی۔

بہت...... بہت ہی خاص۔

انمول......

وہ کہتی تھی۔

''مجھے کس نے یاد کرنا......؟

میرا کون سا کوئی ہے۔اس دنیا میں۔''

مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ مجھے جنم دینے والی ماں کہاں ہے؟ آج وہ زندہ ہوتی تو دیکھتی جو وہ کہتی تھی سچ کہتی تھی۔

مگر ایک بات جھوٹ ثابت ہوئی۔اُسے کس نے یاد کرنا......؟

میں اس کی یاد سے اک لمحہ بھی غافل نہیں ہوتا۔کبھی بھول نہیں پایا۔

یہ کہہ کر شموئیل میرے سامنے رو پڑا۔وہ جویا کی باتیں کرتے کرتے بکھر گیا۔

میں نے اس سے بہت محبت سے بات کی۔اس دن اس نے Lunch میرے ساتھ کیا۔

پھر اکثر ہی وہ آجاتا۔کبھی میں بھی اس کے ساتھ شاپنگ کرنے چلی جاتی۔عادل کو بتاتی رہتی شموئیل آیا تھا۔جویا کی ساری کہانی عادل کو سنائی۔عادل کام اور دوا اور چار کے چکر میں رہتا۔وہ کسی سے بھی کام کی حد تک ملتا اس سے آگے نہ بڑھتا۔

وہ ہر ایک سے کام لینا جانتا تھا۔مگر بیوی کو وقت دینا وہ بھول چکا تھا۔جب بہت خوشحالی نہ تھی عادل میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔

جب سے بزنس چمک اُٹھا وہ فائدہ اور نقصان کے علاوہ کوئی بات نہ کرتا۔ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے گئے۔

ایسے میں شموئیل ہماری زندگی میں آ گیا۔میری ہمدردی سے وہ سنبھل گیا۔وہ خود کو مجرم سمجھتا تھا کہ جویا میری وجہ سے مرگئی۔

میرے بار بار احساس دلانے پر وہ جان گیا۔

''وہ اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھی۔ہاں یہ غلط کیا جو اسے کہا نہیں جو وہ سننا چاہتی تھی۔''اقرار اسے چند لمحوں کی خوشی دے سکتا تھا۔

پتہ نہیں کب اور کیسے میں شموئیل کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔پچھلا سارا سال میں خود کو لعنت ملامت کرتی رہی کہ یہ میں کیا کر رہی ہوں...... مجھے اپنے بچوں سے بہت محبت ہے۔عادل کے بغیر میں نہیں رہ سکتی مگر جب شموئیل نہیں آتا میں بے چین ہو جاتی ہوں۔

وہ اپنی ساری شاپنگ میری پسند کی کرتا ہے۔ میرے ساتھ Lunch اور Dinner بھی کرتا ہے۔کبھی عادل اور بچے ساتھ ہوتے ہیں تو کبھی ہم اکیلے...... مجھے اپنے ضائع ہونے اور شمویئل کے دیر سے ملنے کا افسوس رہتا ہے۔

میرا اپنے گھر دل نہیں لگتا، میں گھر سے باہر رہوں تو خوش، گھر آتے ہی مجھے ڈپریشن ہو جاتا ہے۔گھر میں ہر نعمت ہے۔آسائش ہے مگر سکونِ دل نہیں، سخت گرمی میں مجھے کمرے سے باہر سکون ملتا ہے۔ایئر کنڈیشنڈ روم میں جاؤں تو طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے۔

میں حاصل اور لا حاصل کے درمیان معلق رہتی ہوں کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے میں پاگل ہو گئی ہوں۔ عادل میرا اب خیال بھی رکھتے ہیں......مگر دل کو قرار نہیں۔

عشنا بولتی رہی۔کبھی رونے لگتی کبھی ناخنوں کو کھرچنے لگتی۔

اس کے اندر کا حال اس کے ہاتھوں کی حرکت سے صاف ظاہر تھا۔ وہ بار بار اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ سے مروڑنے لگتی۔

بوا نے بتایا، کھانا تیار ہے کہیں تو لگا دوں میں نے کہا۔ظہر کی نماز پڑھ لوں پھر لگا دینا۔عشنا سے کہا۔

آؤ وضو کر لیں، نماز کے بعد دُعا بھی کرتے ہیں۔ وہ خالق و مالک ہے۔ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کرنے والا ہے۔تم سے انجانے میں خطا ہوئی کہ نامحرم سے تعلقات استوار کر لئے۔رب کے حضور جھک جاؤ۔اس سے اپنی خطا کی معافی طلب کرو۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔اس کے سامنے حاضر رہا کرو۔ اپنی طلب بیان کرو۔ وہ حاجت روا ہے۔

مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی تو عشنا نے اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھا، سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے مجھے وہ بہت اچھی لگی۔ میں نے صدقِ دل سے اس کے لئے دُعا کی۔

بوا نے کھانے کے لئے دسترخوان بچھایا تو عشنا بھی ہاتھ دھو کر آ بیٹھی۔

میں نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔''انسان خطا کا پُتلا ہے۔ وہ غلطی کرتا رہتا ہے، معافی طلب کرتا رہتا ہے۔ مالک معاف کرتا رہتا ہے لیکن اگر اپنی غلطی تسلیم ہی نہ کی جائے پھر بے قراری بڑھ جاتی ہے۔ جب کبھی بے چینی کا سامنا ہو وضو کر کے دو نفل حاجت کے ادا کرنا۔ رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کرنا۔تم محسوس کرو گی رونے سے توبہ کرنے سے مٹی کا وجود کتنا ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔

''کوشش کرنا...... چادر میں کوئی چھید نہ ہونے پائے اور چار دیواری میں کوئی چور رستہ نہ کھلے۔ چادر اور چار دیواری کی حُرمت کا خیال رکھنا۔''

فرصت

ایک وقت تھا۔ جب گھڑیاں رینگ رینگ کر گزرتی تھیں صبح سے دوپہر ہونے تک ڈھیروں کام نپٹ جاتے تھے۔ دوپہر سے شام اور رات گئے تک وقت نہیں گزرتا تھا۔ سُست روی سے گزرتا وقت ڈھیر ساری فرصت اپنے دامن میں سمیٹ رکھتا تھا۔ ماں کو دن بھر کے کام نپٹا کر اپنے بچوں سے کھیلنے کا اور باتیں کرنے کا وقت مل جاتا تھا۔ مگر اب تو وقت پَر لگا کے اڑتا ہے۔ کسی کے پاس کسی کا دُکھ سُکھ سننے کا وقت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اماں مجھے دودھ سے بھرا فیڈر تھما کر تیزی سے جھاڑو لگاتی۔ پھر کچن کا رُخ کرتی۔ میں غڑاپ سے سارا دودھ پی کر فیڈر فرش پر پھینک دیتا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کچن کی طرف جاتا۔ اماں کا پلو پکڑ کر کھینچتا۔ میرا دل چاہتا اماں میرے ساتھ سوئے۔ مجھے گیت سُنائے۔ جیسے ہی اماں کو احساس ہوتا ہے کہ میں پاس کھڑا ہوں اور دوپٹہ کھینچ رہا ہوں تو اماں جان جاتی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ چولہا بند کرتی۔ ہنڈیا ڈھک کر مجھ کو گود میں اٹھا لیتی۔ بے تحاشا پیار کرتی اور مجھے گود میں لے کر لوری سناتی۔

''چندا سی دلہن لاؤں گی
تاروں سے گھر کو سجاؤں گی۔''

اماں آنکھیں بند کر کے خوبصورت آواز میں گاتی رہتی میں سنتا رہتا۔ گاتے ہوئے اماں یہ بھول جاتی کہ سارے گھر کا کام ابھی پڑا ہے۔ میں سنتے سنتے سو جاتا۔ اماں کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہوتیں مگر اُٹھ کر منہ دھو کر کاموں میں لگ جاتی اور بار بار آ کر مجھ کو دیکھتی۔ اس طرح ہر روز ہی دن گزر جاتا اور رات آنگن میں اُتر آتی۔ میں دیر تک اماں، ابا سے کھیلنا چاہتا۔ مگر ابا کام سے اتنا تھک کر آتا کہ کھانے کے فوراً بعد سو جاتا۔ اماں بڑی مشکل سے آنکھیں کھولے میرے ساتھ کھیلتی پھر اماں کی آنکھ لگ جاتی۔ میں اماں کے بالوں سے، کان کی بالی سے کھیلتے کھیلتے سو جاتا۔ مجھے اماں کی کان کی بالی بہت پسند تھی۔ جب اماں بات کرتی تو کان کی بالی ہلنے لگتی۔ کبھی کبھی اماں کو جانے کیا ہوتا کہ مجھے لوری سُناتے سُناتے رو پڑتی۔ وقت کا پرندہ اپنی اُڑان اُڑتا رہا۔ میں سکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی آ گیا۔ اماں ابھی بھی بھاگ بھاگ کر میرے کام کرتی تھی۔ مگر اب وہ تھکنے لگی تھی۔ دو بہنیں بیاہ کر اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ پتہ نہیں اماں کا پیار مجھ سے انوکھا سا تھا۔ پُر اسرار سا۔ ماں کی محبت بھید بھری چُپ جیسی ہوتی ہے۔ اس کی محبت کے الوہی روپ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اماں نے میری شادی کرنے میں دیر نہیں کی۔ میں راضی نہ تھا۔ ابھی میں چاہتا تھا کہ کبھی فرصت نکال کر ڈھیر ساری باتیں اماں سے کروں۔ کچھ اماں کی سنوں۔ اماں میری سنے۔ جب یہ باتیں اماں سے کہتا۔

وہ کہتی۔ ''تیری دلہن آ جائے گی تو وہ کام کرے گی پھر میں تیرے ساتھ خوب باتیں کروں گی۔''

مگر وقت بڑا ظالم ہے اس کا ہر قدم پہلے سے زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے۔ میری شادی پر اماں نے واقعی تاروں سے گھر کو سجا دیا۔ سارا گھر روشن تھا۔ جگ مگ کر رہا تھا۔ جب دلہن آئی تو ہر ایک نے کہا کہ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ مجھے بھی وہ اچھی لگی۔ آخر وہ اماں کا انتخاب تھی......

میری زندگی یوں بدلی کہ بدلتی ہی چلی گئی۔ مجھے کبھی خیال نہ آتا کہ اماں کا لباس اب ملگجا ہے۔ نہ بال بناتی۔ بس چپ چاپ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی۔ میرے پاس اتنا بھی وقت نہ رہا کہ اماں کے پاس بیٹھ لیتا۔ ان سے ڈھیر ساری نہ سہی چند باتیں ہی کر لیتا۔ میں جب بھی شام کو گھر آتا۔ میری بیوی یعنی اماں کی چندا نے کوئی نہ کوئی کام نکالا ہوتا۔ مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا۔ میری بیوی اماں سے کھچی سی رہتی۔ وہ گھلنا ملنا نہ تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ اماں شام کو قرآن پاک پڑھتی اور ساتھ ساتھ کچھ کاپی میں لکھتی رہتی۔ میں کبھی پاس جا کر بیٹھ جاتا تو میری بیوی سب کام چھوڑ کر ہمارے پاس آ کھڑی ہوتی۔ اماں کہتی، بیٹا جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو، مجھے لگتا، اماں مجھے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ ہمیشہ کچھ باتیں، جملے ادھورے رہ جاتے۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتا اور میری اماں دوبارہ سے کام میں مصروف ہو جاتی۔ میرے کپڑے دُھل کر تار پر لٹک رہے ہوتے۔ میری شرٹ یا قمیص گر جاتی تو اماں بھاگ کر اُٹھاتی۔ اس کو سونگھتی اور لمبی سانس لے کر رہ جاتی۔ میں اکثر ہی یہ نوٹ کرتا، کبھی شیو بناتے ہوئے، کبھی چائے پیتے ہوئے۔ وہی اماں جو سینے سے چمٹائے رکھتی، جب سے میری شادی ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت دور ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی نہ نظر آیا کہ اماں کے کان کی بالیاں کہاں گئیں۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ہم کہیں گھر سے باہر چلے گئے۔ اماں گھر پہ اکیلی تھی۔ میں نے کہا اماں آپ بھی ساتھ چلیں ذرا طبیعت فریش ہو جائے گی۔ بولیں نہیں بیٹا، میری نماز کا وقت ہو چلا ہے تم اور دلہن جاؤ گھوم پھر آؤ۔ یہ میری اور اماں کی آخری بات تھی۔ جب واپس آیا۔ سیدھا اماں کے کمرے کی طرف گیا دیکھا تو اماں میری تصویر سینے سے لگائے سو رہی تھی۔ میری عادت تھی کہیں سے بھی آتا، سیدھا اماں کے کمرے میں جاتا۔ حالانکہ میری بیوی چڑتی تھی کہ میں کیوں ہر وقت اماں کے آگے پیچھے پھرتا ہوں۔ سمجھ نہیں آتی عورت، عورت سے کیوں چڑنے لگتی ہے۔ اماں تو خود ہی پیچھے ہو کر بہو کو جگہ دیتی چلی گئی اور میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی۔ کیونکہ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا۔ میں تو اماں کے کان کی بالیاں بھی بھول گیا۔ جس سے کھیلتے کھیلتے میں سو جاتا تھا۔ جسے اماں نے میری شادی پہ بیچ کر اپنی بہو کے لیے انگوٹھی خریدی تھی اور مجھے کہا تھا۔ دُلہن کو پہلا تحفہ یہی دینا۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنی تصویر اماں کے ہاتھوں سے لی۔ دیکھا تو اماں نے اوپر لکھا تھا...... آ فرصت سے بیٹھ ذرا دل کھول کے باتیں کریں۔ میں رو پڑا۔ اماں کو آواز دی مگر اماں بہت دور جا چکی تھی۔

''اُٹھو اماں آؤ ڈھیروں باتیں کریں۔ اماں صرف ایک بار اُٹھ جاؤ۔ میں ساری زندگی ان قدموں سے دور نہیں جاؤں گا۔ یوں چپکے سے تو نہ جاؤ......'' میں سسک پڑا۔

میں نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر اپنے منہ پر پھیرا...... چوما......''اماں پالتے ہوئے مجھے یہ بات کیوں نہ سکھائی کہ بھاگتے وقت کو کیسے قابو کرتے ہیں۔ نئے رشتے نبھاتے ہوئے پرانے کیسے سنبھالتے ہیں۔ یوں تو چپ چاپ نہیں جاتے۔ کوئی تو گلہ، شکوہ کیا ہوتا۔ اب تیرے بن کیسے جی پاؤں گا......'' ماں کے بغیر جو میری خاطر سب کام چھوڑ کر فرصت نکالتی تھی۔ جب میری باری آئی تو مجھے یہ گُر آیا ہی نہ کہ ماں کے لیے کیسے وقت نکالتے ہیں۔

میں ننھے بچے کی طرح رو رہا تھا۔ جیسے ماں اسے سوتا چھوڑ کر کسی کام میں لگ جاتی ہے اور وہ ماں کو قریب نہ پا کر ناراض ہو کر غصہ ہو کر روتا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میرا دل میری ماں کے ساتھ ہی دفن ہو گیا اور اس دن سے میں گم صم ہو

گیا ہوں۔ البتہ آج بھی رات کو اماں کی تصویر سے ڈھیروں باتیں کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔
''اماں اب فرصت ہے۔ آ بیٹھ کر باتیں کریں۔''

❍......❖......❍

تلخیٔ حیات

ابھی میں نے ایف اے بھی نہیں پاس کیا تھا۔ کتابیں میری پکی سہیلیاں بھی نہ بن پائی تھیں۔ زندگی کے رنگ کیا......؟ اور کیسے ہوتے ہیں......؟ آنکھ بھر کر کیسے دیکھتے ہیں......؟ مجھے کچھ نہیں پتا۔ ابھی تو مجھے دوپٹہ اوڑھ کر چلنا بھی نہیں آیا تھا۔

میں تیز تیز بھاگتی تو اماں کی آواز آتی۔ ''کیا ہرنی کی طرح بھاگتی پھرتی ہو۔''

میرا دل چاہتا۔ میں بھاگتی جنگل کی طرف نکل جاؤں اور دور تلک بھاگتی ہوئی جاؤں اور ڈھیر سارے پھول چن کر لاؤں۔ کبھی میرا دل چاہتا کہ میں کسی اونچی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر زور سے اپنا نام پکاروں اور بازگشت مجھے دیر تک سنائی دیتی رہے۔

میری یہ خواہشیں میرے اندر ہی دم توڑ گئیں۔ جب ابا نے میرا بیاہ کر دیا۔ اونچے خاندان والوں کی ناک بہت اونچی ہوتی ہے۔ انہیں ہر وقت اپنی ناک کی فکر رہتی ہے کہ کہیں کٹ نہ جائے۔ سال بعد ہی میری گود میں میری کائنات تھی اور اس سے اگلے سال دعا بھی آ موجود ہوئی۔ میں اپنی بچیوں کے ساتھ نافہم سی زندگی کے دن سے رات کرنے لگی۔

میرے میاں بہت اچھے میرا خیال رکھنے والے تھے۔ بچیوں کو سنبھالنے میں بھی میری مدد کرتے۔ ساس بہت باتیں بناتی مگر انہوں نے کان نہ دھرا۔ کہتے بڑی کمسنی میں تیری شادی ہوگئی۔ اوپر سے دو بچیوں کا ساتھ۔ میرے شب و روز پَر لگا کر اُڑتے رہے۔ میں ان کے ساتھ خوش اور مطمئن تھی۔

میرا اطمینان اس دن لُٹ گیا۔ جس دن میرے سر سے لال سرخ پھولوں والا دوپٹہ کھینچ کر سفید اوڑھا دیا گیا۔ میری گلابی چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں میری کلائیوں کو زخمی کر گئیں۔ زخموں سے خون رِسنے لگا۔ میرے بازوؤں پر مرچیں سی لگ گئی تھیں۔ میں رِستا خون دیکھ کر احساس سے عاری بیٹھی تھی۔ میری دعا اور کائنات نہ جانے کس کے پاس تھیں۔ میں پتھر بن گئی تھی۔

میری ساس کہہ رہی تھی۔ ''منحوس میرے بیٹے کو کھا گئی۔''

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہ کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔

ایک آواز آئی، بہو دعا کو دودھ پلا دو یہ رو رہی ہے۔''

میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گرتی پڑتی جنگل میں بھاگی جا رہی ہوں۔ میرا دوپٹہ تار تار ہو گیا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ میرے سر سے خون بہہ کر میرے پاؤں تک آ رہا تھا...... میں اوندھے منہ گری۔ میں نے ایک چیخ ماری اور زور زور سے رونے لگی۔

عورتوں کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ رو لینے دو، کوئی اسے چپ نہ کروائے۔ ورنہ غم اس کے دل پر بوجھ بن جائے گا، پھر میں ایسا بلک بلک کر روئی کہ ہر آنکھ رو پڑی۔

ابا آگے بڑھ کر بولے۔''بس کر میری دھی صبر کر۔وہ اتنی ہی حیاتی لے کر آیا تھا۔''

پھر میں منحوس کیسے ہوئی......؟ میری چیخیں میری ساس کے سامنے سوالیہ انداز میں کھڑی تھیں...... میں کس کو منحوس کہوں؟ میری زندگی کو کس کی نظر لگ گئی۔

میں روتے روتے غش کھا کر گری۔

ہوش اس وقت آیا۔جب میرا ہمسفر جو چند گھنٹے پہلے میرے ناز اٹھاتا تھا۔سفید کفن پہن کر سرخ گلابوں کے ہار پہنے اپنے ابدی سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔کوئی آخری وعدہ نہ ہوا کوئی بات نہ ہوئی۔باقی جیون کیسے بتانا یہ بھی نہ سمجھایا۔

سفید کار تیزی سے مخالف سمت سے آتی ہوئی مجھ سہاگن کو سفید لباس پہنا گئی اور میری زندگی سے سب رنگ چھین کر لے گئی۔

اب زندگی پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔میں اگر بال نہیں بناتی تو عورتیں کہتیں ہیں،مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔اگر ذرا سا بالوں میں کنگھا پھیر لیتی ہوں تو ساس کہتی ہے۔

''ہار سنگھار کس کے لیے کرتی ہو؟ تجھے کیا......؟ دل کا ٹکڑا تو میرا چلا گیا...... بی بی تیری جوانی کی میں حفاظت نہیں کر سکتی......؟ اپنے ابا سے بول تجھے لے جائے۔میرا کیا میں آج مری یا کل...... میں نہ رہی تو کوے گدھ تجھے نوچ کر کھائیں گے۔''

ایک دن ابا مجھے اور میری بیٹیوں کو لے آیا۔اس گھر میں جہاں میں گڑیوں سے کھیلتی تھی۔آج اس آنگن میں میری دعا اور کائنات جب گڑیوں کے ساتھ کھیلتی ہیں تو میں کانپ جاتی ہوں کہ بیٹیاں تو پیاری ہوتی ہیں۔مگر ان کے نصیب ڈراتے ہیں،رُلاتے ہیں۔مجھے زندگی کے اس موڑ پر تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

اگر آج تعلیم یافتہ ہوتی تو میں اور میری بیٹیاں کسی پر بوجھ نہ ہوتیں۔ملنے جلنے والے کہتے ہیں کہ بیٹی کی دوسری شادی کر دو۔ایسے تن تنہا زندگی کیونکر گزرے گی ابا اور اماں کا ایک ہی جواب ہے کہ ہمارے ہاں بیٹی کی شادی ایک ہی بار ہوتی ہے۔اس کی ساری زندگی اب ان بیٹیوں کے سہارے گزرے گی۔

ہماری گلی کے پیچھے ایک خالہ نے اپنے بھانجے کے لیے بات کی کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔وہ آپ کی بیٹی کو سہارا دینے کو تیار ہے مگر ابا اور اماں کا وہی انکار میں بھلا کیا بول سکتی ہوں......؟ میں تو بیوہ ہوں،زندگی پر میرا اختیار صرف اتنا ہی ہے کہ سانس آتی جاتی رہے۔میں گہرا رنگ نہیں پہن سکتی رنگ میری زندگی سے بے دخل ہو گئے ہیں۔

اب میری بچیوں نے بولنا سیکھ لیا ہے کائنات اکثر کہتی ہے۔مما میرا دل چاہتا ہے کہ آپ بھی سمرن کی مما کی طرح بال کھول کے سرخ رنگ کا سوٹ پہن کے میک اَپ کریں۔آپ کتنی پیاری لگیں گی۔

دعا بولی۔''نانو کہتی ہیں مما بیوہ ہے اور بیوہ میک اَپ نہیں کر سکتی۔''

میں اٹھ کر چھت پر چلی گئی اور خوب روئی۔میں جانتی ہوں کہ میرا دل ابھی بھی نہیں مرا،میں بھی بننا سنورنا چاہتی ہوں۔یہ کل ہی کی بات ہے۔جب سب سو گئے تو میں نے ایک پرانی لپ اسٹک نکالی اپنے ہونٹوں پر لگائی،سیاہ گھنے لمبے بالوں کو کھلا چھوڑ کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھتی ہوں میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوں۔جلد ہی میں لپ اسٹک صاف کرتی ہوں۔اپنے بال کس کر باندھ لیتی ہوں میں خود کو سرزنش کرتی ہوں بجلی کی طرح یہ خیال میرے اندر کوندا۔میں تو بیوہ ہوں اور ایک بیوہ کو سنگھار کا حق نہیں...... میں اکثر ہی خواب دیکھتی ہوں کہ گھنے جنگل میں ایک گھڑ سوار آتا ہے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جنگل کی سیر کرواتا اور کئی رنگوں کے پھولوں سے میری جھولی بھر دیتا ہے وہ میرے حسن کی تعریف کرتا تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے مگر جیسے ہی آنکھ کھلتی ہے کائنات اور دعا کو دیکھتی

ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ بھی میرے ساتھ جنگل میں پھول چننے گئیں تھیں۔ ان کے چہرے مسکرار ہے ہیں میری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں...... میں اللہ سے شکوہ کرتی ہوں کہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟

آخر اس میں کیا مصلحت ہے...... میرا کون سہارا ہے؟

کائنات اور دعا مولوی صاحب کی بیوی سے نورانی قاعدہ پڑھنے جاتی ہیں کل میں جب انہیں لینے گئی تو آپا جی نے کہا۔ ''بیٹی اپنی زندگی خراب نہ کر پہاڑ جیسی زندگی کیسے اکیلی بسر کرو گی، پھر دو بچیوں کا ساتھ ہے۔''

میں نے کہا آپا جی ہمارے ہاں دوسری شادی کا تصور نہیں ہے۔

وہ بولیں بیٹی۔ ''یہ بھلا کون سی کتاب میں لکھا ہے۔ تیرے ابا اماں سے بات کروں گی، تم بھلا بے چاری کیا بولو گی۔''

میں جانتی ہوں اماں ابا کو کوئی راضی نہیں کر سکتا، پہلے تو میرا بھی دل نہیں مانتا تھا مگر کائنات اور دعا اکثر سوال کرتی ہیں۔

''مما ہمارا اپنا گھر کون سا ہوگا...... سب کے مما پاپا تو ساتھ رہتے ہیں...... ہم کیوں نانا ابو کے گھر رہتے ہیں؟''

کائنات کہتی ہے۔ ''میرا بہت دل چاہتا ہے میں اپنے پاپا کی انگلی پکڑ کر دور سیر کے لیے جاؤں اور واپسی پر آپ کے لیے اور دعا کے لیے ڈھیر ساری ٹافیاں لاؤں۔''

میں مر کر بھی اپنی دوسری شادی کے لیے ابا اماں سے نہیں کہہ پاؤں گی۔ میری بیٹیاں میری طرح بہت سی محرومیوں کے ساتھ زندگی بسر کریں گی۔ میں نے اپنے دل کو تو سمجھا لیا ہے مگر پھر بھی اکثر یہ خیال ستاتا ہے کہ زندگی اب میری کیوں نہیں؟

❍......❖......❍

بھلا آدمی

اماں ہر وقت سلائی مشین پر کچھ نہ کچھ سلائی کرتی رہتی۔ ابھی اماں نے ایک سلائی لگائی ہی تھی۔ بالے نے آ کر کہا۔ ''اماں تایا آیا ہے۔''

اماں نے جلدی سے دوپٹہ پیشانی تک کھینچ لیا اور احتراماً مشین پرے رکھ دی اور یوں بیٹھ گئی جیسے تایا کا انتظار کر رہی ہو۔ تایا بڑے ہی دھیمے مزاج کے ہیں۔ کبھی نظر اٹھا کر بات نہیں کرتے۔ جھکی جھکی نظر سے بات کرتے اور چلے جاتے۔ تایا کے آنے پر اماں پینو اور چھینو کو سلام کرنے اور شربت بنانے کو بھی کہتی۔ تایا سختی سے منع کرتے کہ ان کے لیے کچھ نہ بنایا جائے۔ ابا کے مرنے کے بعد تایا مہینہ میں ایک بار ضرور آتے کچھ پیسے اماں کی مشین پر رکھ دیتے اور چل دیتے۔

''اچھا ثریا بیٹی میری نماز کا وقت ہو گیا ہے اب میں چلوں۔''

یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر دروازہ پار کر جاتے تایا کے جانے کے بعد اماں دیر تک جھولی پھیلائے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے تایا کے لیے دعائیں کرتی رہتی۔

لیکن بڑی حیرت کی بات تھی کہ اپنے ماں جائے ہمارے مامے کے آنے پر اماں کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جاتا۔ ہمارا ماما بھی کیا انسان تھا۔ آنکھیں یوں ہر وقت ناچتی رہتیں۔ جیسے پھرکی۔ وہ اتنی تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھتے کہ جیسے کسی روبوٹ کی آنکھیں ہوں۔ وہ جیسے ہی اماں کے پاس آ کر بیٹھتا۔ اماں کی مشین بھی غصے سے چلانے لگتی۔ یوں لگتا مشین کو بھی اماں کی طرح اس کی آمد ناگوار گزری ہے۔ اماں شیرنی کی سی آنکھوں سے پینو اور چھینو کو دیکھتی اور اشارے سے دوپٹہ ٹھیک طرح سے لینے کو کہتی۔ پینو اور چھینو لیے ہوئے دوپٹے کو اور پھیلا لیتیں۔ مگر اماں کی تسلی نہ ہوتی۔ دونوں حیران ہوتیں کہ اماں مامے کو اچھا کیوں نہیں سمجھتی......؟

ماما آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ کھانا کھا کر ہی جائے۔ کبھی چائے سے پہلے پانی، تو کبھی چائے کے بعد شربت پینے کی فرمائش کرتا...... ماما کچھ بھی مانگتا۔ اماں خود ہی ہر چیز اٹھ کر دیتی۔ دونوں بہنوں کو سختی سے منع تھا۔ زیادہ مامے کے پاس نہیں آنا...... مامے کی بھی بڑی بری عادت تھی کہ سر پر پیار دیتے ہوئے منہ پر ہاتھ لگاتا۔ دونوں چڑتی تھیں۔

ایک دن پینو نے پوچھا۔

''اماں! کیا ماما اچھا آدمی نہیں ہے؟''

''دفع ہو جا...... زبان کاٹ دوں گی۔ جتنی بات سمجھائی جائے اسی پر عمل کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اماں نے اپنی جوتی اسے دے ماری

۔

ایک دن پینو چائے بنا رہی تھی۔ کہ ماما آ گیا۔ اماں ذرا ہمسائی کی طرف گئی تھی۔ چھینو نیم کے نیچے اپنا سکول کا کام کر رہی تھی۔ پینو

نے ماما کو بٹھایا اور چائے کا پوچھا تو ماما بولا۔

''لو نیکی اور پوچھ پوچھ.....'' ساتھ ہی ناچتی آنکھوں سے مسکرایا۔

پینو کو اس کے مسکرانے سے آگ لگ گئی.....جلدی سے چائے بنائی اور پیالی میں ڈال کر ماما کو پکڑائی تو اس نے پیالی پکڑتے ہوئے پینو کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ پینو کو بڑا برا لگا۔ جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا ایسا کرتے ہوئے چائے مامے کے کپڑوں پر اور پینو کے ہاتھ پر گری۔

اتنے میں اماں آ گئی۔ مامے کو دیکھ کر تو اس کا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا۔ مشین کو پٹخا۔ پھر پاس پڑی سٹیل کی پیالی کو فرش پر پھینکا۔ مامے نے جلدی سے چائے پی اور چلا گیا۔ اماں نے پینو سے پوچھا۔''کتنے بجے آیا ماما.....؟ تم کیا کر رہی تھی.....؟ چائے کیسے گری.....؟''

بے چاری روہانسی ہو کر جواب دیتی رہی۔

پھر اماں سے لاڈ کرتی ہوئی بولی۔''اماں ماما، تایا جیسا کیوں نہیں؟ تایا پر ایک فرشتہ کا گماں ہوتا ہے اور مامے پر شیطان کا۔'' اسے ابھی بھی اپنے ہاتھ پر مامے کے لمس کا ناخوشگوار احساس ہو رہا تھا۔

اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔''بیٹا مردوں کی بڑی قسمیں ہیں۔ تایا تمہارے تو جنتی ہیں۔ فرشتہ صفت ہیں۔ فرشتہ صفت مرد چھاؤں کی طرح ہوتا ہے۔ تمہارے مامے جیسے مرد تو نیکی کے نام پر دھبہ ہوتے ہیں..... ماما اصل میں اماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ اور لوگوں کو دکھاوا کرتا کہ بیوہ بہن کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ جھوٹ کا رونا بھی ماما کو بڑی اچھی طرح آتا تھا۔

ایک دن اماں کو جانے کیا سوجھی کہ ہم دونوں بہنوں کو پاس بٹھا کر سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''پینو اور چھینو میری بات دھیان سے سن لو۔ دنیا کو پرکھنے کا طور طریقہ سیکھ لو۔ ماں سدا ساتھ نہیں رہتی۔ مرد کے دل کا سارا بھید اس کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ وہ زبان سے سو ہمدردی جتا رہا ہو۔ اگر آنکھیں ساتھ نہ دیں تو جان لو کہ دغا باز ہے۔ اندر کہیں جھوٹ چھپا رکھا ہے۔''

پینو کو بے اختیار مامے کی آنکھیں اور ساتھ ہی تایا کا جھکا چہرہ یاد آ گیا۔

چھینو کو پتہ نہیں کیا یاد آیا بولی۔''اماں ایک بات پوچھوں کیا ابا تایا جیسے تھے یا مامے کی طرح.....؟''

اماں ایک سرد آہ بھر کر بولی۔''اب کیا بتاؤں.....؟ بھلا آدمی تھا.....'' پھر اماں چپ سی ہو گئی اور اپنی چُپ سے بولی۔

وہ میرے بچوں کا باپ تھا۔ اب کیا کہوں میری چھوٹی بہن پر نظر رکھتا تھا۔ بالا ہونے والا تھا میں بے ڈھب سی اُسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ ان دنوں پتہ نہیں میرے گھر والے کو کیا ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے شمیم بانو کو غور سے دیکھتا پھر میری طرف۔

شمیم بانو کو بھی پتنگے سے لگ گئے۔''بھاجی'' کہتی آگے پیچھے پھرتی۔ میں ان دنوں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ میں زیادہ سوچتی تو لگتا میں بہن پر شک کر رہی ہوں۔

ایک دن تہجد کے وقت میرے دل میں بڑی آگ لگی گھر والے کی مسکراہٹیں اور شمیم بانو کی اٹکھیلیاں۔ ادھر تہجد کی اذان شروع ہوئی، اُدھر میں نے رب کو پکار لیا پھر بچے والی حالت میں تو رب اور بھی قریب ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے رب سے کہا۔ میرے مولا اگر میں سچی ہوں اور بشیرا میرے ساتھ فراڈ کرتا ہے..... شمیم بانو میرے گھر والے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ تو یا اللہ ان دونوں میں سے ایک کل مجھے نظر نہ آئے.....

اگلے دن میرا گھر والا دنیا سے چلا گیا۔

اماں کی چُپ یہ سُن کر اٹھی اور گھر سے باہر نکل گئی۔
پینو اور چھینو اماں کو گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بولیں۔
''شکر ہے۔ ہمارا ابا بھلا آدمی تھا۔''

❍......❖......❍

چرخہ

پنجاب کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولنے والی میں پہلی لڑکی تھی، میرے بعد تین اور آ گئیں، میرے ابا کی کمر اور اماں کا سر جھکتا چلا گیا...... یوں تو ہمارے گھر میں حوا کی بیٹیاں ہر وقت چہکتی پھرتیں مگر اماں کا حکم تھا کہ جیسے ہی ابا گھر آئے سامنے نہ آیا کرو۔ مجھے ایسے لگتا شاید ہمیں دیکھ کر ابا کا دم گھٹتا ہے۔ ابا بڑے ہی پیار کرنے والے تھے روز کچھ نہ کچھ ہمارے لیے لے کر آتے۔ ہماری دادی جسے ہم بے جی کہتے تھے وہ چرخہ کاتتی رہتی تھی کبھی پرانے کپڑے کا بان بناتی تو کبھی باریک باریک دھاگے سے نلیاں بھرتیں پھر کروشیے سے بڑے بڑے میز پوش، ٹرے کور اور گلاس کور بناتی۔ ہماری اماں سلائی کی بڑی ماہر سمجھی جاتی۔ بے جی اور اماں کو دیکھتے دیکھتے ہم نے سکول کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھوڑا بہت سیکھ لیا۔

کپڑے سلائی کروانے والی ہر عورت کہتی۔ ''اس گھر کی بیٹیاں بہت جلدی بیاہ کر اگلے گھر چلی جائیں گی۔ ماشاء اللہ ہنر مند گھرانے کی لڑکیاں جو ہوئیں۔''

ابا کو شوق تھا ہم بس پڑھتی رہیں پنساری کی دکان سے کوئی نہ کوئی پرانا اخبار لے آتے اور ہم بہنیں باری باری پڑھتیں اور ابا ہمارا علم شوق دیکھ کر خوش ہوتے۔ میں سالوں کا سفر طے کرتی بیس برس کی ہو گئی اور سلائی کڑھائی کروشیا ہر کام میں ماہر ہو گئی۔ میرے رشتے کی بات چلائی گئی مگر جو بھی رشتہ آتا یوں لگتا انہوں نے مجھے نہیں ہمارا سارا گھر ہی بیاہ کر لے جانا ہے۔ ابا بے چارے کئی قسم کے بسکٹ، نمکو لے کر آتے، دودھ اتنا مہنگا ہو گیا تھا کہ ایک کپ چائے بیس روپے کی بنتی اور کلو دودھ سے بڑی مشکل سے آٹھ، دس چائے کے کپ بنتے تھے۔ دودھ بھی آج کل کون سا خالص ملتا۔ رشتہ والے ہمارے گھر میں چرخہ، سلائی مشین دیکھ کر جاتے اور پلٹ کر نہ آتے۔

اماں چپکے چپکے ابا سے پوچھتی۔ ''کچھ بتایا انہوں نے۔''

مگر ابا ایک لمبی چپ اوڑھ کر بان کی ننگی چارپائی پر لیٹ جاتے اور کروٹ لے کر یوں گویا ہوتے۔

''بھلی مانس جا جا کر تُو بھی سو جا۔''

وقت بہت بدل گیا ہے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں لوگ ہمارے گھر چرخہ دیکھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں بے جی جس نے یہی چرخہ کات کر بیوگی میں بھی ہمیں پروان چڑھایا ہمیں کھلایا، پڑھایا۔ مشکل دنوں میں یہی چرخہ بے جی ساری ساری رات کات کر مشکلوں کا مقابلہ کرتی تھی۔ آج اس چرخے میں لوگوں کو عیب نظر آنے لگے ہیں۔

ابا کی لمبی چپ دیکھ کر اماں ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ جاتی اور ابا کی خاموش باتوں کا ایک بھی لفظ نہ سن پاتی۔

ایک دن رشتہ کروانے والی خالہ آئی تو اماں نے اسے پوچھا کہ ''بہن جو بھی آتا ہے پلٹ کر نہیں آتا۔ میری بیٹیوں میں سلیقہ مندی، شرافت، حیا، خوبصورتی میں کہیں بھی کوئی کمی نہیں۔ پھر ایسا کیوں......؟''

خالہ بولی۔''بہن خدالگتی کہوں گی برانہ ماننا۔ابھی بھی آپ کا گھرانہ بہت پیچھے ہے۔ٹی وی،کمپیوٹراوربجلی سے چلنے والی بھانت بھانت کی مشینوں کے آگے اب کہاں کھڈی اور چرخہ چلتا ہے۔اب تو ہر کام مشین کرتی ہےتمہارے گھر کا ماحول چالیس سالہ پرانا ہے، دنیابہت ترقی کرگئی ہے اب تو لڑکیاں دفتروں میں،سکولوں میں نوکری کرتی ہیں اب کروشیے کو کون پوچھتا ہے......؟ ذرا گھر کا ماحول بدلو ،بچیوں کو پہننا،اوڑھنا سکھاؤ،خالی خوبصورتی کو کون پوچھتا ہے جب تک اس میں نئے زمانے کا رنگ نہ ہو۔''

خالہ تو یہ کہہ کر چلی گئی مگر اماں سوچ میں پڑگئی کہ کہاں سے شروع کریں بدلنا۔وہ سارادن خاموش سی گھر میں اِدھراُدھر دیکھتی رہی کہ کہاں سے کیا بدلنا ہے۔مگر بے بس سوچتی ہی رہی۔پھر اماں نے فیصلہ کیا کہ جب کوئی رشتہ کے لیے آئیں گے تو ہم بے جی کا چرخہ چھپادیں گے۔سلائی مشین بھی،تاکہ آنے والوں کو پتہ بھی نہ چلے کہ ہم ابھی تک پرانے لوگ ہیں۔ہمیں نئے زمانے کی سمجھ نہیں ہے۔ہم بھی آج کل کےلوگوں کی طرح جھوٹ بول کراپنا آپ چھپالیں گے۔

اگلے دن ہی خالہ ایک رشتہ کے ساتھ آموجود ہوئی۔اماں نے مجھے بال کھولنے اور سرخی لگانے کو کہا ساتھ سمجھایا کہ تھوڑا سا دوپٹہ سر پرٹکانا پھر سرننگا کرلینا تاکہ تیرے گھنے بال نظر آئیں۔میں حیران رہ گئی کہ یہ وہ اماں تو نہیں جو ہروقت سر پر دوپٹہ جمانے کو کہتی، اذان ہوتے وقت تو ذرا سا بھی دوپٹہ ہل جاتا تو خوب سناتی۔اماں مجھے بہت بدلی ہوئی سی لگی۔

اماں کو کون سمجھاتا کہ جھوٹ کا سفر بڑااوکھا ہوتا ہے۔بھلا جھوٹ کے پرندہ پر کب تک سواری کی جاسکتی ہے۔وہ تو کسی بھی وقت گراسکتا ہے۔جھوٹ کے نہ تو پَر ہوتے ہیں نہ پیر۔بے جی چپ،کچھ نہ بول رہی تھیں کہ دیکھوں بھلا بناوٹ کے سہارے بھی رشتے بنائے جاتے ہیں۔وہ خواتین آئیں۔مجھے بڑا پسند کیا۔چائے پی اورمسکراتے ہوئے سارے گھر کو یوں دیکھا جیسے سارا گھر میرے ساتھ بیاہ کرجانا ہے۔پھر ایک خاتون جولڑکے کی ماں تھی اس نے چرخے کے اوپرڈالا ہوا کپڑا اٹھا کر دیکھا تو حیرانی سے بولی کیا آپ لوگ جولاہے ہو؟

بے جی کو اپنے چرخے کو چھپانے پر پہلے ہی بہت اعتراض تھا آگے بڑھ کر بولی نہیں ہم جولاہے تو نہیں ہم ہوشیارپور کے زمیندار ہیں ہجرت کی یہاں آکر ہمیں کچھ نہ ملایا سمجھو ہمیں لینا ہی نہ آیا اوراپنے ملک اپنی سرزمین کی ترقی کے لئے تو محنت کرنے سے نہیں شرمانا چاہیے۔یہ میرا چرخہ ہے۔یہ میری پہچان ہے،میرے پنجاب کی ثقافت ہے۔ہماری نانی،دادی بھی اس کو کات کرکھڈی پر اپنا پہناوا تیارکرتی تھیں۔بے جی نے اپنے چرخہ کو پیار کرتے ہوئے بڑی تفصیل سے بتایا اوراپنا چرخہ اٹھا کرصحن میں بیٹھ گئی اور یوں لاپرواہ نظر آئیں،جیسے انہیں ان رشتہ کی غرض سے آنے والی خواتین سے کوئی غرض نہ ہو۔

اماں جو صبح سے جھوٹ بول بول کر بناوٹ کا لبادہ اوڑھ کرخودکو بدلا ظاہر کررہی تھی،تھک کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ان خواتین نے دہلیز پار کرنے میں دیر نہ کی۔میرا دوپٹہ سرسے سرک گیا۔میرے کھلے بال بکھر گئے۔میں بت بنی کھڑی تھی۔

بے جی کی کڑک دارآواز سنائی دی۔''ہاجرہ اپنے بال باندھواور جاکرمنہ دھولو......''

پھراماں سے مخاطب ہوئیں۔

''اللہ پر بھروسہ کرنا سیکھو دلہن ایسے جھوٹ بول بول کر بیٹیاں نہیں بیاہی جاتیں اپنے اصل پر فخر کرنا سیکھو۔میں نے بیوگی میں اکیلی عورت ہوکر بیٹے پال لیے۔تجھے تو اللہ نے اپنی رحمتوں سے نوازا ہے۔جس نے بیٹیاں دی ہیں وہی وسیلے پیدا کرے گا۔ہم چاروں بہنیں اب اداس سی بےیقینی کی حالت میں چپ چاپ اپنا اپنا کام لے کر بیٹھ گئیں۔رشتہ کروانے والی خالہ ایک ماہ نہ آئی۔تو اماں کا دل چاہے خود جاکراسے کہہ آؤں کہ کوئی اور جگہ دیکھو۔

ماں کا دل، اس کی کیفیت کوئی نہیں جان پاتا۔ اسے اپنی چار جواں بیٹیوں کی جوانی بڑھاپے میں داخل ہوتی دکھائی پڑتی۔ ماں کے وہم کا بھی کوئی علاج نہیں ہوتا۔ ماں کے دل کو اللہ ہی جانتا ہے۔

ایک دن خالہ آئی تو اس نے کہا کہ میرے ایک جاننے والے ہیں۔ ان کے بیٹے کو چرخہ چاہیے۔ وہ لاہور میں پڑھتا ہے۔ اسے چرخہ پر کات کر کھڈی پر کوئی ڈیزائن بنانا ہے۔

یوں لاہور کا فیشن ڈیزائنر علی فہد ہمارے گھر ہر روز ہی آتا اور بے جی کو کچھ سمجھاتا۔ بے جی اسے تیار کر دیتی اس نے اپنی مرضی کے دھاگے اور کروشیے سے رنگا رنگ ڈیزائن تیار کروائے۔ پھر اس نے ایک بیڈ شیٹ بنوائی جو ہم چاروں بہنوں نے مل کر تیار کی۔ اس نے ہمارے گھر کھڈی لگوادی۔ کھڈی پر اس نے ابا سے جانے کیا کیا بنوایا۔ وہ بتاتا میں یہ بنوانا چاہتا ہوں۔ ابا کہتے بن جائے گا۔

ایک دن وہ بولا، بے جی آپ کا گھرانہ بے مثال ہے، بجلی اور گیس کے بحران سے ہمارا ملک بہت پیچھے جا رہا ہے۔ کروڑوں کی لاگت سے خریدی مشینیں اب بے کار پڑی ہیں۔ ہمیں پھر سے کھڈی اور چرخہ کو رواج دینا ہوگا۔ جب ہر گھر میں کھڈی چلے گی اور چرخہ کاتا جائے گا تو خوشحالی لانے میں دیر نہ لگے گی۔ آج ملک میں جو بے چینی اور بے سکونی ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ بجلی آتی ہے تو زندگی دکھائی دیتی ہے، بجلی نہیں ہوتی تو ہر کوئی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا سوچتا ہے کہ اب کیا کروں......؟ بے جی چائنہ میں ابھی بھی کھڈی پر کام ہوتا ہے۔ وہاں کی عورتیں کروشیے سے بہت کچھ تیار کرتی ہیں۔ پھر ہماری عورت جو ہنر مند اور محنتی ہے۔ وہ کیوں بیٹھی رہے۔ میں تو لاہور جا کر ایک انڈسٹری لگا رہا ہوں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ آپ عورتوں کو چرخہ کاتنا اور کروشیا سکھانا...... ماں جی ہم ساتھ اپنی بوتیک بنائیں گے۔ لباس کی تیاری میں آپ میرا ساتھ دینا۔

یوں علی نے ہمیں لا کر لاہور بسا دیا اس نے بڑی ترقی کی۔ اس کے ساتھ ہم نے بھی۔ اب کھڈی کا شعبہ ابا کے سپرد تھا، کروشیے کا بے جی کے پاس اور بوتیک کا سارا کام ہم بہنوں اور اماں کے پاس تھا۔

بجلی کے آنے اور نہ آنے سے ہمیں کوئی فرق نہ پڑتا۔ ہمیں اس کے بغیر ہی کام کرنے کی عادت تھی۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد ہم سب اپنا کام شروع کر دیتے اور مغرب کی اذان کے ساتھ ہی بند۔ یہ سب بے جی کے حکم سے ہو رہا تھا۔ وہ کہتی تھیں۔ ''دن اللہ نے کام کرنے کو بنایا ہے۔''

ایک سال بعد ہی میں مسز علی بن گئی۔ یہ سب علی کی مرضی سے ہی ہوا۔ علی کے والدین بھی پنجاب کے جٹ تھے۔ انہیں ہمارا گھرانہ بھی بہت پسند آیا۔ وہ محنت پسند تھے۔ تین سال میں ہم بہنیں بیاہی بھی گئیں اور محنت کے بل بوتے پر ہم نے وہ سب پالیا جو سوچا نہ تھا۔ لوگ ہماری محنت کی مثال دیتے ہیں۔ بے جی خوش ہوتی ہیں کہ اللہ پر بھروسہ کر کے ہم نے بڑا نفع کمایا۔ زندگی کو خوشحال پایا۔

علی کہتے ہیں۔ ''اگر ہمارے ملک میں بھی ہینڈی کرافٹ پر توجہ دی جائے تو بہت جلد ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔ ملک سے جرائم کا خاتمہ ہوگا۔ نوجوان نسل اس وقت منفی سوچتی ہے جب اس کے پاس کچھ کرنے کو نہیں ہوتا۔ بس ایک راستہ ایک منزل دکھانے کی دیر ہے۔''

○......❖......○

نصیبوں جلی

کچھ لوگ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں ۔ میں بڑی بدنصیب پیدا ہوئی کیونکہ آنکھ کھولی ہی تھی ۔ زندگی کو ابھی ایک لمحہ ہی نہ دیکھا تھا۔ ماں کے لمس کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ کہ اس نے زندگی سے منہ موڑ لیا۔ اس سے پہلے اس نے اولاد چھننے کا دکھ دیکھا تھا۔ جب بھی نئے مہمان کی آمد ہوتی ۔ وہ ماں کے دل کو سکوں کے بجائے بے سکون کر جاتا اور دنیا کو ایک نظر دیکھتا۔ تھوڑا سا روتا نئی جگہ دیکھ کر پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیتا۔ روح جو کبھی بھی اپنے کل سے بچھڑ کر خوش نہیں ہوتی ۔ لمحہ بھر کو بے چین ہوتی ۔ اللہ کو اس کی بے چینی ایسی بھاتی کہ وہ واپس اپنے خالق کی طرف چل دیتی اور میری ماں کی گود خالی ہی رہ جاتی ۔ اس طرح میری ماں نے میری پیدائش سے پہلے چار بچے پیدا کیئے ۔ اور ان کی جدائی سہی ۔ جب میں زندگی کی نئی نوید لے کر آئی تو میری ماں دنیا سے چلی گئی ۔

نہ میں نے ماں دیکھی ۔ نہ ماں کا پیار بھرا لہجہ...... نہ محبت ۔ بس میں محبت پانے کی جستجو میں اِدھر سے اُدھر سرگرداں رہی ۔ دادی نے ابا کا بیاہ اور رچا دیا۔ مجھے دادی نے رکھ لیا۔ میں دادی اور دادا کے بڑھاپے کا سہارا بن گئی میرے پانچ چچا تھے ۔ سب بیوی بچوں والے تھے ۔ ایک تایا تھے ۔ جب تک دادی زندہ رہی ۔ اس نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا ۔ اور میں دو بوڑھوں کے ساتھ رہ کر کیسی ہوں گی؟ بچوں جیسی میرے اندر کوئی بات نہ تھی میرے چچا تایا بڑی اچھی زندی گزار رہے تھے ۔ چونکہ وہ ذرا فاصلے پر رہتے تھے ۔ وہ کبھی بھی دادا، دادی سے ملنے روز نہ آتے تھے ۔ دادا گھر میں سوت کات کر گزارہ کرتے تھے میں بڑی ہوئی تو سکول جانا شروع کیا۔ دادی میرے لمبے بالوں کو ایسے کس کر باندھتی کہ جیسے ساری زندگی نہیں کھولنے ۔ یوں ایک دن کے باندھے بال پورا ہفتہ گزر جاتا۔ جب دادی دیکھتی کہ میرے بال نکل کر اِدھر اُدھر اُڑ رہے ہیں ۔ تو میں اور میرے بال دادی کے قابو میں آتے ۔

یوں وقت گزرنے کے ساتھ میں بڑی ہوئی تو دادی، دادا بوڑھے اور کمزور ہونے لگے ۔ ایک دن دادی کو فالج ہو گیا۔ میں نے سکول چھوڑ کر دادی کو سنبھالنا شروع کیا۔ دادا کبھی بھی کوئی پھل یا مٹھائی نہ لاتے تھے ۔ کیونکہ اس کے پاس اتنے پیسے ہی نہ تھے ۔ کبھی کبھی دادا، دادی کو دلیہ کھلاتے ہوئے رو پڑتے کہ ہمارے آٹھ بچے ہیں کوئی نہیں ہمیں پوچھتا۔ ہم مر گئے تو رجو کا کیا بنے گا۔ میرا نام تو رضیہ تھا۔ مگر سب رجو کہتے تھے ۔ شروع میں دادی بہت ڈانٹتی اگر کوئی میرا نام خراب کرتا اب تو دادی نہ بول سکتی تھی ۔ نہ ڈانٹ سکتی تھی ۔ دادا سارا دن سوت کاتتے پھر شام کو ہانڈی پکاتے ۔ میں پاس بیٹھی انہیں دیکھتی رہتی ۔ رات کو میں دادی کے ساتھ چمٹ کر سو جاتی ۔ دادا اکثر کہتے رجو اب تم اکیلی سویا کرو ۔ دادی کو تنگ نہ کیا کرو ۔ میں الگ سونے کی کوشش بھی کرتی ۔ مگر آدھی رات تک نیند نہ آتی تو میں چپکے سے دادی کے پاس آ جاتی ۔ یوں لگتا وہ بھی میرا انتظار کر رہی ہوتی تھی ۔ سب بچے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتے تو میرا بھی دل چاہتا کہ میرا بھی کوئی بہن بھائی ہو ۔ میں بھی اس کے ساتھ کھیلوں ۔ میں دل میں یہ حسرت لے کر دوسروں کو دیکھتی رہتی ۔ چچا تایا کے بچے مجھے کہتے تو بہن تھے ۔ مگر سمجھتے نہ تھے ۔ انہیں یا ان کی ماؤں کو میں کام کے وقت یاد آتی تھی...... کام ختم تو میں کون؟ میں دادا کو بتاتی

تو وہ گم صم سے ہو جاتے۔

دادا اکثر کہتے رجو میری اولاد بڑی نافرمان نکلی۔ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر سب کچھ کھاتے پیتے ہیں۔ کبھی کسی نے نہیں کہا۔ ''ابا تجھے یہ پھل پسند ہیں نا تیرے لیے لایا ہوں......'' دادی کی طرف اشارہ کرتے۔ ''تُو اچھی ہے۔ تجھے کوئی سوچ نہیں تنگ کرتی۔''

دادی بس خالی خالی نظروں سے دیکھتی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے اور دوپٹے میں جذب ہو جاتے۔ میں اُٹھ کر دادی کی آنکھیں صاف کرتی اور انگلی منہ پر رکھتے ہوئے چُپ ہونے کا اشارہ کرتی تو دادی منہ پھیر لیتی۔ ایک دن دادی نے ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ پھیر لیا۔ سب چچا، تایا بیویوں اور بچوں سمیت آئے اور چلے گئے۔ دادی کے جانے کے بعد پہلی رات میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ میں ساری رات جاگتی رہی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھے لگا......آج میری ماں مرگئی۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ کبھی میں دعا مانگنے لگتی۔ اللہ میرے پیارے اللہ! صبح تک میں بھی مر جاؤں۔ میں تو دادی کے بغیر سو نہیں سکتی۔ مجھے دادی کے ساتھ اتنی سونے کی عادت تھی میں کبھی کسی کے گھر رات نہ رکی تھی۔ تایا چاچا کے کام ختم ہوتے ہی اپنے گھر بھاگتی تھی۔

○......❖......○

تہجد کی اذان ہوئی تو دادا کے وضو کرنے کی آواز آئی۔ پھر دادا نے نفل پڑھے اور سجدے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ میں بستر سے اُٹھ کر دادا کے پاس گئی۔ دادا نے سجدے سے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں، سرخ وسفید چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ میں دادا کے گلے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

ایک دن دادا صبح سے گئے ہوئے تھے کہیں۔ میں نے آٹے کا کنستر کھولا......وہ خالی......کوئی دال، چاول کچھ نہ تھا۔ میں بیٹھی سوچوں کہ اب کیا پکاؤں......؟ تھوڑی دیر بعد وہ آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک روٹی اور دو پکوڑے تھے۔

دادا بولے۔ ''رجّو یہ کھا لو، کل آٹا لاؤں گا۔''

دادا کو میری فکر لگ گئی تھی کہ ان کی زندگی میں ہی کہیں میرا رشتہ طے ہو جائے مگر مجھ بوڑھی روح کو تایا چچا کے گھروں سے تو ٹھکرا دیا گیا۔ میں نصیبوں جلی تھی۔ کوئی مجھے دل سے چاہتا نہ تھا۔ بس کام کی غرض تک سب کی چاہت۔

جب بھی کسی چچا کے گھر نئے فرد کا اضافہ ہوتا وہاں چاچی کی خدمت کے لیے میں یاد آتی۔ خدمت کا وقت جیسے ہی گزر جاتا۔ میں ان کو بری لگنے لگتی۔ کبھی کوئی مروتاً بھی نہ کہتا۔

''کچھ دن اور رہ لو۔''

میں دکھی دل کے ساتھ واپس دادا کے پاس آ جاتی۔ اس دن مجھے بڑا سکون ملتا۔ میں پوچھتی

''دادا! میرے جانے کے بعد کھانا بھی ٹھیک سے کھاتے تھے......؟''

''جھلی ہوئی ہو۔ زندہ ایسے ہی ہوں۔'' وہ مسکرا کر کہتے۔

ایک رات میں بڑی گہری نیند سوئی۔ میں کبھی ایسی گہری نیند نہ سوئی تھی۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں نے دیکھا دادا ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔ میں چھلانگ لگا کر دادا کی طرف بھاگی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا......کچھ ہو گیا ہے۔ بھلا مجھے کیسے ہمت ہوئی اتنی میٹھی نیند سونے کی......میں اس قابل ہوں بھلا۔ میں تو منحوس ہوں جو ماں کو پیدا ہوتے ہی کھا گئی۔ (یہ میری چاچیاں کہتی تھیں۔)

''دادا......'' میں نے ڈرتے ڈرتے آواز دی۔

میں نے دادا کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ دادا کا چہرہ سرد تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ آنسوؤں کی ایک پتلی سی لکیر دونوں آنکھوں کے

کناروں پر جم گئی تھی۔ دادا کے ہونٹ ایسے تھے۔ جیسے اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کی ہو۔ میں نے تکیہ دیکھا...... گیلا تھا۔ سفید قمیص بھی کہیں کہیں سے گیلی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا دادا روتے رہے ہیں۔

دادا کل سے بہت پریشان تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو چپ ہو رہے۔ مگر رات کو ابا کا ایک دوست آ کر بیٹھا تو اسے بتانے لگے کہ چھوٹا بیٹا یہ گھر مانگتا ہے۔ کہتا ہے آپ میرے ساتھ رہیں میں رجو کی شادی بھی کر دوں گا۔ دو کمروں کے گھر میں اس کا گزارہ نہیں ہو رہا تھا...... دادا نے سب کو دو دو کمروں کے گھر بنا کر دیئے تھے اور کہا تھا کہ یہ صرف رجو کو ملے گا۔ چچا یہ گھر نہ ملنے کی صورت میں اپنے اپاہج بیٹے کے ساتھ میرا رشتہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ تا کہ ان کو دونوں طرح سے فائدہ ہو جائے، دادا نے اپنے دوست سے کہا۔

''خورشید احمد یاری نبھانا میں نہ رہا تو رجو کو رُلنے نہ دینا۔ میرے بیٹوں سے کہہ دینا۔ یہ گھر رجو کا ہی ہے۔ اس سے یہ چھت نہ چھیننا۔'' میں اندر گئی تو دادا خاموش ہو گئے تھے۔ دادا کو یہ بات اتنی پریشان کر گئی کہ انہوں نے اس خود غرض دنیا سے منہ ہی موڑ لیا۔ میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی۔ چھوٹے چچا نے آ کر اسی دن قبضہ کر لیا گھر پر۔ انہوں نے سب کو کہہ دیا کہ ابا مجھے کہہ گئے تھے کہ میں نہ رہوں تو رجّو کے پاس آ جانا اور اس کی شادی کا سوچنا۔

دادا کے بعد میں چپ سی ہو گئی۔ ایک دن ابا کے دوست آئے اور انہوں نے چچا سے دادا کی وصیت کی بات کی تو چچا آپے سے باہر ہو گئے۔ بولے

''تمہیں اتنی ہی یہ منحوس عزیز ہے تو اسے اپنے گھر کی عزت بنا لو۔''

وہ سمجھدار اور زبان دے کر پھرنے والے نہ تھے۔ فوراً کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے آج سے یہ بیٹی میری ہے۔ تمہارے پاس امانت ہے۔''

چچا آنکھیں نکال کر بولے۔ ''ابھی کر و اس پر عمل کرو۔ اتنے ہی غیرت مند ہو تو اپنی زبان کی کہی نبھاؤ۔ سو اس بھلے آدمی نے اپنی بات نبھائی اور اپنے درزی بیٹے کی بیوی بنا کر اپنے غریب خانے لے گیا۔

یوں میں ایک بدحال گھر سے نکل کر اپنے میاں کی محرومیوں کے ساتھ نبھا کرنے لگی۔ میری شادی کو بارہ سال ہو گئے۔ میری گود ہری نہ ہوئی۔ کبھی ملا تو کھا لیا نہ ملا تو بھوکے ہی سو گئے۔ آمدن اتنی نہ تھی کہ خوشحال زندگی کے رنگ دیکھتی۔ سسک سسک کر زندگی اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

شادی کو تیرہواں سال ابھی لگا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری سُن لی۔ زندگی میں پہلی بار میں خوش ہوئی تھی۔ مجھے ایسے لگتا میں اُڑتی پھرتی ہوں۔ کبھی میں کہتی دادا کی دعائیں لگ گئیں۔ کبھی کہتی دادی کی...... رات کو سوتی تو گل گوتھنا ننھا سا بچہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر سو جاتا۔ میں مسکرا دیتی۔

صبح اٹھتی تو میرا چہرہ کھِلا کھِلا سا ہوتا۔ میں خوبصورت ہو گئی تھی۔ میری آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ میں ہر وقت ایک ہی بات سوچتی اب میرا بھی اپنا کوئی ہوگا۔ میں نے بہت سارے ننھے منے کپڑے سی لیے۔ غرضیکہ میں اپنے بچے کے لیے وہ سب چاہتی تھی۔ جن سے میں محروم رہی تھی۔ میں نے سوچ سوچ کر ہر رنگ کے کپڑے بنائے۔ موزے، ٹوپی، فیڈر کور، نیکریں، چھوٹے چھوٹے رومال وغیرہ۔

میری ساس کہتی۔ ''ابھی سے اتنی تیاریاں کرو گی تو ہلکان ہو جاؤ گی ابھی پورے پانچ ماہ پڑے ہیں۔''

میں صبح جیسے ہی اٹھتی دعا کرتی۔ ''اے میرے اللہ یہ دن جلدی سے گزر جائیں۔'' میرا بس نہ چلتا تھا کہ گھڑی کی سوئیوں کو گھما کر سارا وقت آگے لے جاؤں۔ پتا نہیں ساری زندگی کچھ بھی مجھے اچھا نہ ملا تھا۔ اتنی بڑی خوشی پا کر میرا کیا حال ہونا تھا۔ میں یہ سوچ کر

مسکرادیتی۔میری ساس میرے صدقے واری جاتی۔

میرے سب چچا،تایا کے بچے بارہ سال میں سب بیاہے گئے تھے۔اور سب بچوں والے تھے۔جب بھی کسی کے ہاں بچہ جنم لیتا فون کر کے بتاتے۔تو مجھے یوں لگتا۔جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔تُو یہاں آ کر بھی ہم سے ہار گئی۔ابھی تک خالی گود ہو۔میں بہت کم جاتی تھی ان کی طرف۔اب میں نے سوچ لیا تھا کہ میں چھلہ نہا کر سب سے پہلے ان سب کی طرف جاؤں گی اور سب کو اپنا بچہ دکھاؤں گی۔پھر سب کو پتہ چل جائے گا۔کہ اب میں تنہا نہیں ہوں۔میں خیالوں میں اپنے بچے کے ساتھ کھیلتی۔اس سے باتیں کرتی تو کسی وقت میری آواز بلند ہو جاتی اور میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔کسی نے مجھے دیکھا تو نہیں۔

میں خواب دیکھتی۔میرا بچہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے وہ مجھے بڑے پیار سے دیکھتا ہے۔میں اسے دیکھتی ہوں تو چھپ جاتا ہے۔پھر میں اُسے ڈھونڈتی ہوں۔میں صبح اٹھ کر کہتی کہ میرا بچہ بہت ہی شرارتی ہوگا۔مجھے تنگ کیا کرے گا۔کوئی بات نہیں۔میں اس کی ماں ہوں وہ مجھے تنگ نہیں کرے گا تو اور کس کو کرے گا۔میں خود سے سوال جواب کرتی۔

مشکل وقت بڑی آسانی سے گزر گیا۔میں نے ہر درد کو خوشی سے سہا۔

جمعہ کی صبح صبح اللہ تعالیٰ نے میری گود بھر دی۔میری نظریں اس سے ہٹ نہیں پا رہی تھیں۔میری ساس نے کہا اتنے غور سے نہ دیکھو۔ماں کی نظر لگ جاتی ہے۔میں نے جلدی سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔مجھے اپنا بیٹا ہر طرف نظر آتا۔

میں جب اسے اپنی گود میں لے کر بیٹھتی تو اسے کہتی۔

''میری جان!اب میں اکیلی نہیں ہوں اگر کوئی مجھے برا بھلا کہے گا تو میرا بیٹا میری ڈھال بنے گا ہے نا۔''

میں ہر روز اس سے ایسی ہزاروں باتیں کرتی پھر بھی ایسے لگتا میں نے کوئی بات نہیں کی میں نے اپنے چچا،تایا کے سب بچوں کو فون کر کے بتایا کہ اللہ نے مجھے بڑا خوبصورت بیٹا عطا کیا ہے۔بہرحال سب نے خوشی کا اظہار کیا اور خواہش ظاہر کی۔اب جلدی سے آنا۔مجھے ایسے لگا میرے بیٹے کی وجہ سے میری بہت عزت ہوگئی ہے۔پہلے چاچیاں اپنی بیٹیوں اور بہوؤں کو جب وہ امید سے ہوتیں مجھ سے دور رکھتیں۔کہیں میری نحوست کا سایہ ان پر نہ پڑ جائے۔میں کڑھتی اور روتی تھی۔آج یہ دکھ بھی ختم ہو گیا۔میرا بیٹا ہی میرا سب کچھ تھا۔مجھے کسی سے کیا سروکار؟

دن بڑی تیزی سے گزر گئے پتہ بھی نہ چلا۔بیٹا دو ماہ کا ہوا تو میری ساس نے کہا۔''اب تم اپنی چاچیوں اور تائی سے مل آؤ۔اتنی بار کہہ چکے ہیں ورنہ کہیں گے کہ اب نخرہ کرنے لگی ہے۔بیٹی!رشتے نہیں چھوٹتے مجبوراً بھی ملنا پڑتا ہے۔سو اپنی ساس کے بار بار کہنے پر میں نے تیاری کر لی۔اور اپنے بیٹے کے ڈھیر سارے اچھے اچھے کپڑے رکھے۔کس کے گھر جاتے وقت کیا پہنانا ہے؟......میں نے سب سوچ لیا تھا۔میں چاہتی تھی میرا بیٹا سب کو اتنا اچھا لگے۔کہ سب اس کو پیار کریں۔جس دن میں اس گھر میں گئی جہاں میں دادا،دادی کے ساتھ رہتی تھی۔مجھے سب کچھ بہت یاد آیا۔مگر میں نے جلدی سے ان کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔کہ اب میں نے کبھی بھی اداس نہیں ہونا۔سب چچیوں اور تائی نے میرے بیٹے کے لئے تحفے تحائف لے کر رکھے تھے۔جس گھر بھی جاتی میں لدی پھندی واپس آتی۔میں ایک ہفتہ چھوٹے چچا کے گھر رہی۔اب میں نے سوچا کہ واپسی کی تیاری کروں۔میری ساس مجھے لینے آ گئی تھی۔اپنے بیٹے کو سُلا کر میں سامان پیک کرنے لگی۔

اچانک چچی بولیں۔''ربّو کاکے کو دیکھو اس کے ماتھے پر پسینہ کیوں آ رہا ہے۔اتنی سردی میں بھی،میں گھبرا گئی۔بھاگ کر اپنے بیٹے کو گود میں لے لیا۔وہ پسینے میں شرابور تھا۔اس کا رنگ نیلا سا ہو گیا۔میں اسے لے کر ننگے پاؤں ہی گلی میں ڈاکٹر کے پاس بھاگی۔

میرے چچا تایا سب محلے والے جمع ہو گئے سب مجھ سے اب پیار کرنے لگے تھے۔ اپنی اولاد کو دیکھ کر اب انہیں میری محرومیوں کا احساس تھا۔ مگر میں نے ان سب کی محبت کو کیا کرنا۔ میری محبت، میری جان، میری روح تو چھن گئی۔ میری گود میں میرے بچے کا مردہ وجود تھا۔ میں کانپ رہی تھی۔ میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ ہر طرف شور مچ گیا کہ رجو کے بیٹے کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور مر گیا۔ میں نے دیوار پر سر مار کر لہولہان کر لیا۔ مگر میرا بیٹا بھی مجھے محرومی دے گیا۔

میں نے کہا نا میں نصیبوں جلی ہوں۔ پھر کیسے بھاگوان بنتی۔ میں اس قابل ہی نہیں تھی۔ کہ میں ماں بنتی۔ مجھے دے کر چھین لیا گیا۔ 365 دن سے بھی زیادہ گزر گئے۔ مجھے اس سے کھیلتے ہوئے۔ پھر وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ میرا کوئی زور نہیں چل رہا تھا کہ میں کسی طرح اپنا بیٹا واپس لے آؤں...... بھلا وہاں سے کوئی واپس بھی آتا ہے اس دن میں ایسا بلک بلک کر روئی تھی۔ کہ میری سب چاچیاں اور تائی، چچا، تایا سب میرے ساتھ چیخ چیخ کر روئے۔ رجو ہم نے آج تک تجھے کچھ نہیں دیا۔ تُو ہمارے گھر بھری گود سے آئی۔ ہم تجھے کس منہ سے خالی گود بھیجیں گے۔ اندر میرا باپ میری ساس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

''ہمیں معاف کر دو بہن ہم تیری امانت کی حفاظت نہیں کر سکے۔ ہماری بیٹی بے قصور ہے۔ اسے معاف کر دو۔ میری ساس نے ایک بار بھی میرے باپ کے ہاتھ نہ پکڑے اور نہ کہا کہ یہ تو اللہ کی مرضی تھی۔

میرے سارے خواب ٹوٹ گئے۔ کپڑے سلے رہ گئے۔ میرے سارے خونی رشتے جنہوں نے ساری زندگی مجھے اپنا نہ سمجھا۔ آج میرے دکھ پر سسک پڑے۔ مجھے سہارا دے کر میرے ساتھ میرے گھر آئے۔ جس کمرے میں، مَیں نے اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کیں۔ کھیلی...... وہاں اب صرف اس کی چیزیں پڑی ہیں مگر وہ خود نہیں ہے۔ اس نے جاتے وقت ایک بار بھی مجھے نہ پکارا...... ''اماں''......ایک بار تو کہہ دیتا۔

مجھ نصیبوں جلی کو یہ سننا بھی نصیب نہ ہوا۔ اولاد بڑھاپے میں ماں باپ کو نہیں پوچھتی۔ میں کہتی ہوں۔ کوئی بات نہیں اولاد تو آنکھ کا تارا ہی رہتی ہے۔ چاہے نفرت ہی کرے۔ ماں کے دل سے کوئی پوچھے۔ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ میں آج بھی یعنی چھ سال گزر گئے اس بات کو اس دکھ کو، میں اسی محرومی کے ساتھ جی رہی ہوں۔ ہر رات جلدی سے سو جاتی ہوں کیونکہ میرا بیٹا ہر روز میرے خواب میں آتا ہے۔ میرے ساتھ کھیلتا ہے۔ ''اماں'' کہہ کر چھپ جاتا ہے۔ میں ساری رات اسے ڈھونڈتی ہوں پر نہیں ملتا۔ اگر آپ کو ملے تو کہنا۔ ''ماؤں کو ایسے نہیں ستاتے۔ ماؤں کے دل تو ویسے ہی دکھی ہوتے ہیں۔ رات کو دیر نہیں کرتے گھر پہنچنے میں۔ ان کے دل ڈوب جاتے ہیں۔ وہ سو نہیں پاتیں بھلا ان آنکھوں میں نیند کیسے آئے جو آنکھیں انتظار کی سولی پہ لٹکی ہوتی ہیں۔ ان کے ہونٹوں پہ ہنسی کیسے آئے جو ہونٹ انجانے خوف سے دعا گو ہوں۔'' اسے کہنا کبھی تو کسی روپ میں ماں کے آنسو پونچھنے آئے۔ ماں کو اپنا کہنے آئے کیونکہ اس دنیا میں سوائے اس کے ماں کا کوئی بھی تو اپنا نہیں ہے۔''

آج پورے چھ سال ہو گئے ہیں۔ اُسے مجھے چھوڑ کر گئے ہوئے۔ میرے اندر کوئی امید دوبارہ نہ جنم لے سکی۔ شاید میں اپنے بیٹے کو بھول جاتی۔ اگر اللہ مجھ نصیبوں جلی کو ایک بیٹی ہی دے دیتا۔ میں آج بھی گھنٹوں اپنے بیٹے کی تصویر دیکھتی ہوں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔

میں نے اپنے بیٹے کی ایک چھوٹی سی بنیان سنبھال رکھی ہے۔ جو اس نے پہلی بار پہنی تھی۔ اس میں سے اس کی خوشبو ابھی بھی آتی ہے۔ میں رات کو اپنے سینے سے لگا کر سوتی ہوں۔ میری رات اس خوشبو کے سہارے گزر جاتی ہے۔ میں چپکے چپکے روتی بھی ہوں کہ آج اگر میرا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ سکول جاتا۔ مجھے سارا دن فرصت نہیں ملتی تھی۔ سکول سے آ کر اس نے کتنی ہی فرمائشیں کرنی تھیں۔ یہ

کھاؤں گا۔ وہ نہیں کھاؤں گا۔ میں نے اس کے پیچھے پیچھے پھرنا تھا۔ ایک دن بازار گئی۔ ایک بچہ پیچھے سے آ کر مجھے اپنی ماں سمجھ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میرا دل تڑپ کر ایسے لگا باہر نکل آئے گا۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اپنا کلیجہ تھام لیا۔ اس بچے کی ماں اسے پکڑ کر لے گئی تو میں پاگلوں کی طرح کئی قدم ان کے پیچھے گئی۔ میں نے کچھ بھی نہ خریدا۔ گھر واپس آ گئی۔ رونے لگی...... میں کیا کروں......؟ مجھے خود پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ شاید میں پاگل ہو گئی ہوں۔

❍......❖......❍

معاوضہ ایک کہانی کا

میں حرف کی پہچان سے جملہ بنانے اور جملوں سے کہانی اور واقعہ، لکھنے کا سفر طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ اب میں کوئی بھی کہانی لکھنا چاہوں مکمل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔مگر پچھلے کچھ ماہ سے میرے ساتھ عجیب ہی معاملہ ہے کہ ایک کہانی شروع کی مگر مکمل نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں ہر روز سوچتا کہ اب لکھوں مگر میرا دل مجھے قلم پکڑنے ہی نہ دیتا۔ میں شروع سے بتاتا ہوں پھر آپ کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ ہاں تو میں نے بتایا کہ میں ایک رائٹر ہوں۔لوگ کہتے ہیں کہ میں اچھا لکھتا ہوں۔مگر آج تک میں نے کسی کہانی سے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا۔ایک ڈائجسٹ میں میری کہانی چھپتی ہے۔لوگ بہت واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔مگر مجھے کبھی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ میں کوئی مطالبہ کرسکوں۔ میں ہر بار جب بھی نئی کہانی لے کر جاتا ہوں ایڈیٹر میری کہانی لے کر رکھ لیتا ہے۔ایک چائے کا کپ پی کر میں اُٹھ جاتا ہوں۔ چائے کے ہر گھونٹ پر میں سوچتا ہوں کہ اب اس گھونٹ کے بعد کہانی کے معاوضہ کی بات کرتا ہوں۔ چائے کا کپ خالی ہو جاتا ہے۔مگر میں چپ ہی رہتا ہوں۔ حالانکہ اب میری شرٹ بھی کوئی پہننے کے قابل نہیں رہی۔ میرے جوتوں کے نیچے سوراخ ہو گئے ہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ شاید ہر کوئی میرے جوتوں کے سوراخ دیکھ سکتا ہے اور تو اور میری پھٹی ہوئی بنیان بھی دکھائی دیتی ہوگی۔اور پیچھے سے ایڈیٹر صاحب کی آواز آئے گی۔کہ جناب یہ اپنی تمام کہانیوں کا معاوضہ تو لیتے جایئے۔ میں پیچھے مڑوں گا اور ایک بھاری بھرکم لفافہ میرے دل کو باغ و بہار کردے گا۔مگر یہ میری خوش فہمی ہی رہتی ہے۔ میں دفتر سے نکل کر سڑک پر آ جاتا ہوں۔

پچھلے ماہ ایک عجیب بات ہوگئی۔ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ کافی خوبصورت ہے۔ میں اُسے دیکھ کر پہلی بار تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ایک سکول میں اکاؤنٹینٹ ہے۔ بہت پُر اعتماد اور خوبصورت شخصیت کی مالک ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ اس کی بہن کی فیس جمع کروانے گیا تھا۔ باتوں باتوں میں، مَیں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں ایک رائٹر ہوں اور ایک ڈائجسٹ میں لکھتا ہوں ۔اسے بھی ادب سے لگاؤ تھا۔ بات غالب سے شروع ہوئی تو پروین شاکر اور امجد اسلام امجد کی شاعری پر ختم ہوئی۔

میرا بس چلتا تو میں کبھی بھی بات ختم نہ ہونے دیتا۔مگر میرا دوست بولا۔ چلو یار کافی دیر ہوگئی۔ یوں یہ خوبصورت سی ملاقات ختم ہوگئی اور واپسی پر گیٹ کی طرف جاتے ہوئے مجھے یوں لگا...... جیسے میرا وہاں کچھ رہ گیا ہے۔ یہ راحیلہ سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد مجھے جانے کیا ہوا کہ میرا کچھ بھی کرنے کو دل نہ چاہتا۔ نہ کھانا کھانے کو، نہ باہر جانے کو کچھ لکھنے بیٹھتا تو مکمل نہ کر پاتا۔ میرا دل چاہتا کہ اپنی ہر بات راحیلہ سے کروں۔ اپنی دن بھر کی روٹین اسے بتاؤں اور اس سے اس کی مصروفیات کے بارے پوچھوں۔

میں نے ایک دن اپنے دوست سے کہا۔اب کب فیس جمع کروانے جانا ہے؟ وہ بولا۔ ''پاگل ہوا بھی تو پندرہ دن ہوئے ہیں......'' میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا آخر مجھ سے رہا نہ گیا تو میں راحیلہ کے پاس پہنچ گیا کہ مجھے مختلف کلاسز کے بچوں کی فیس معلوم کرنی ہے۔ مجھے لگا کہ راحیلہ بھی مجھے دیکھ کر کھل اٹھی ہے۔ خیر میرا دل تو اسے سامنے پا کر بہت ہی خوش تھا۔ میں نے بہانے بہانے اس سے اس

کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔

مجھے لگتا تھا کہ میری کہانی مکمل ہو جائے گی۔ میں گھر آ کر لکھنے بیٹھا تو راحیلہ کی ہنسی اور چوڑیوں کی جلترنگ نے مجھے ایک لفظ بھی نہ لکھنے دیا۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ میں ایک انجانی لڑکی کی محبت میں کتنا بے بس ہو گیا ہوں۔ مگر اب راحیلہ مجھے انجانی نہ لگتی۔ مجھے ایسے لگتا۔ جیسے وہ میرے گھر میں بھی میرے ساتھ ہے۔ میں اپنی اس کیفیت سے تنگ آ گیا۔ اب میں نے سوچا کہ جب اس سے ملوں گا تو حالِ دل کہہ دوں گا۔ میں نے خود کو کسی حد تک مصروف کرنے کی کوشش کی۔

ایک ماہ بعد جب میں راحیلہ سے ملا۔ تو وہ بولی! ''بڑی دیر بعد آئے خیریت تھی؟'' مجھے لگا کہ آگ دونوں طرف ہے برابر لگی ہوئی۔ میں نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کر دیا۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟ مجھے آج بھی حیرانی ہوتی ہے کہ میں نے کیسے یہ کہہ دیا۔ میں اپنی کہانی کے معاوضہ کی کبھی بات نہ کر سکا تھا۔ اب میں دل ہی دل میں راحیلہ کی ہاں سننے کے اگلے مراحل کی سوچنے لگا۔ راحیلہ چپ بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا کہ خاموشی نیم رضا مندی ہوتی ہے۔ مگر راحیلہ جب بولی تو میری بولتی بند ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ ایک رائٹر ہیں۔ اچھا لکھتے ہیں۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایک کہانی کا کیا معاوضہ ملتا ہے؟'' میں نے بتایا کچھ نہیں۔ وہ بولی۔ ''تین چار گھنٹے کی کہانی لکھ کر بھی آپ کچھ نہیں کماتے۔ میرے اخراجات، میری فرمائشیں کیسے پوری کریں گے۔ میں یہاں مہینہ بھر میں 15000 ہزار کماتی ہوں۔ میرا ایک اسٹیٹس ہے۔ جس کو برقرار رکھنے کے لیے الفاظ کی نہیں پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے ساتھ چند گھنٹے بات کر کے وقت تو گزار سکتی ہوں زندگی نہیں۔''

میں نے بہت کوشش کی...... کہ میں اسے بتاؤں کہ اب میں نے ایک اور ڈائجسٹ کے لیے لکھنا شروع کیا ہے۔ وہ مجھے اچھا معاوضہ دے گا۔ پھر میری زندگی بھی ایسی نہیں رہے گی۔ مگر میں بول نہ سکا۔ جیسے آج تک میں ایڈیٹر سے اپنی کہانی کے معاوضہ کی کبھی بات نہ کر سکا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی...... کہ راحیلہ اور باقی دنیا مجھ سے کتنا آگے ہے۔ کتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں لوگ......اور میں کتنا کم ہمت کہ میں بول نہ سکا یوں یہ محبت اپنے اختتام کو پہنچی اور گھر آ کر میں نے اپنی کہانی مکمل کرنے کی کوشش کی۔ میں کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ مگر میری کہانی مکمل نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے۔ وہ ایک محبت کی کہانی تھی اور اسے کسی کی محبت ہی مکمل کر سکتی تھی۔

❍......❖......❍

سند آف طلاق یافتہ

ہر روز طلوع ہوتا سورج زندگی کے آگے بڑھنے ،سفر جاری رہنے کا پیغام دیتا ہے، بچپن سے بڑھاپا، زندگی اپنی منزلیں طے کرتی رہتی ہے۔ میرا بچپن بھی تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ، پھول توڑتے کتابوں میں سجاتے سنہری حروف لکھتے اور ان کو چمکتا دیکھ کے خوش ہوتے گزر گیا، بہت جلد میرا بچپن اور لڑکپن تتلیوں کی طرح اڑ گیا مجھے پتہ بھی نہ چلا پھر آنکھوں کو خواب دیکھنے کی عادت سی ہوگئی۔ میں ہر روز شفون کا سفید پھولا ہوا فراک پہنتی ،سنڈریلا بنتی اور اپنا ایک جوتا کہیں بھول آتی اور اس پریشانی میں میرا خواب ٹوٹ جاتا۔ مجھے کبھی نہ پتہ چلا کہ میں کہاں جاتی ہوں پھر میری زندگی کا دھارا نئے رخ پر بہہ نکلا۔خوابوں کی تعبیر پانے نکلی، لال سرخ جوڑا پہنا، کانوں میں بالی، ہاتھ میں کنگن، انگوٹھی، گلے میں ہار، لال سرخ چوڑیاں، شفاف پیشانی پر چمکتا جھومر ہونٹوں پہ مسکان، آنکھوں میں کاجل، سب ہار سنگھار تو کیا تھا۔ میرا روپ سفید دودھ جیسی رنگت میں انوکھا روپ تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ مگر ہمسفر جو ساتھ تھا اس کی شاید دیکھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی یا شاید میرے حسن کی چمک نے اس کی آنکھوں سے بینائی چھین لی۔ اس نے میرا کوئی امتحان بھی نہ لیا شاید میں پاس ہو جاتی پھر زندگی کچھ اور ہوتی۔ اس نے بغیر جانچے پرکھے نہ مجھے کچھ کہنے کی مہلت دی نہ دل میں اتارا، بس اپنے دل سے اتار دیا۔ مجھے مجرم بنا کر تین لفظ طلاق کے کہے اور بابل کی دہلیز پر چھوڑ گیا۔ اس کا دل تو کسی دوسری عورت کے حسن کے جال میں اسیر تھا۔ میری محبت کے دانت تیز نہ تھے جو اس جال کو کاٹ کر اس چند دن کے ہمسفر کو رہا کروا لاتی، اپنی صاف ستھری پیشانی کو داغ سے بچا لیتی، شاید میرے ہار سنگھار میں کوئی کمی رہ گئی۔ میں سہاگن سے طلاق یافتہ بن گئی اس سند نے تو مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ بابل بھی اس کے گھر کا مان بھی۔

آج کے اُگتے سورج نے میرے کان میں سرگوشی کی ہے کہ تجھے طلاق یافتہ ہوئے دس سال ہوگئے ہیں یہ سند بھی کیسی عجیب ہے تعلیم یافتہ ہو کر نوکری ملتی ہے، عزت ملتی ہے، پڑھے لکھے ہونے کا اعزاز ملتا ہے مگر طلاق یافتہ ہو کر ذلت ملتی ہے شک کرتی ہوئی مذاق اڑاتی ہوئی نظریں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ اندازِ تضحیک اپنا کر لوگ پرانی کہانی سنانے کی فرمائش کرتے ہیں پھر اپنی رائے بھی دیتے ہیں مگر چپکے سے تاکہ میں سن نہ لوں......''اس کا کردار صحیح نہ تھا شاید'' یہ جملہ میرے اوپر بم کی طرح گرتا ہے لیکن میں مسکراتے ہوئے ظاہر کرتی ہوں، سنا نہیں، میرا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے میں چیخ اٹھتی ہوں مگر کسی کو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے میرے وجود کے ٹکڑے دکھائی نہیں دیتے۔

ان دس سالوں میں میرے پانچ بہن بھائیوں نے میری شادی کی کوشش کی مگر بدقسمتی سے ایک رشتہ پر ان کا اتفاق رائے نہیں ہو پاتا تو یہ رشتہ کہیں اور طے پا جاتا ہے۔ وہاں شادی ہوتی ہے اور اس پرانے رشتے کی بات میرے سامنے دہرائی جاتی ہے کہ وہ رشتہ بھی فلاں کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ ابا کے نہ ہونے سے کوئی بھی میری ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ مجھے پتہ بھی ہے کہ ہر بار جب بھی رشتہ

آ تا ہے میں بسکٹ، چائے، بوتل کبھی کبھی تو کھانا بھی بناتی ہوں سب انتظام کرتی ہوں پھر دعا بھی کرتی ہوں اب کی بار میرا گھر بس جائے۔ رشتے والے ہاں کر کے گئے اور بہن، بہنوئیوں، بھائی بھابیوں کا اجلاس ہوتا ہے۔ ہر ایک کو آزادی رائے حاصل ہے مگر مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا۔ سب کی طرف سے ہاں ہے...... پھر کوئی بھابی یا بہنوئی کہتا ہے کہ بھئی فلاں بات میرے دل کو نہیں لگی۔ کل رشتہ دار بات کریں تو میری ذمہ داری نہیں۔ بس اجلاس ختم اقرار، انکار میں بدل جاتا ہے۔ کھانا کھا کر رشتہ کروانے والی کو کہا جاتا ہے۔ ''آپا جی کوئی اور رشتہ دکھائیں۔''

میری زندگی کے دس سال اسی بات کی نذر ہو گئے کہ رشتہ دار، خاندان کیا کہے گا؟

ایک بار میں بیمار ہو گئی کسی بھابی نے آ کر نہ پوچھا۔ ''چندا کیا بات ہے؟ آج صبح سویرے کیوں نہ اٹھی؟'' میں جب چڑیا کو دیکھتی ہوں وہ اپنے گھونسلے میں اپنے بچوں کے پاس کتنے فخر سے بیٹھتی ہے پَروں کو پھیلا پھیلا کر اِترا کے اڑتی ہے دانہ دنکا لا کر ننھی ننھی چونچوں میں ڈالتی ہے تو مجھے اپنا وجود چڑیا سے کمتر لگتا ہے میں سوچتی ہوں مجھ سے اچھی تو چڑیا ہے جو گھر والی ہے۔

زندگی کا سفر تو آگے بڑھتا ہی اچھا لگتا ہے ایک جگہ ٹھہر کر تو پانی بھی بدبو پیدا کر دیتا ہے۔ زندگی جہاں ٹھہر جاتی ہے وہاں بدمزاجی، تنک مزاج اور چڑ چڑے پن کی عجیب سی کڑواہٹ زندگی کے رنگوں کو پھیکا کر دیتی ہے پھر زندگی کو پرکھنے اور اس کے انداز واطوار بدل جاتے ہیں زندگی کی اصل روح اپنا آپ کھو بیٹھتی ہے۔ جیسے میں ہو گئی ہوں بدمزاج، نکمی، چڑ چڑی سی۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ میں نفسیاتی مریض بنتی جا رہی ہوں میں ایسی تو نہ تھی۔ میں بھرپور زندگی سے آشنا تھی اگر اب میں ایسی ہو گئی ہوں تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟

○......❖......○

صبح نو

آج صبح سے ہی موسم اَبر آلود تھا۔ اولڈ کیمپس کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں اپنے گروپ میں سے میں اکیلی ہی تھی۔ آخری کلاس لے کر میں چپ چاپ French ڈیپارٹمنٹ کی طرف برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ نیو کیمپس ہاسٹل جا کر بھی کیا کرتی۔ روم میٹ بھی گھر گئی ہوئی تھی۔ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ وہ دشمنِ جاں ڈھونڈتا ہوا اِدھر ہی میرے پاس آ کھڑا ہوا۔

ارسل مجید میرا کلاس فیلو ایک ذہین وفطین طالب علم پچھلے سال بھی ٹاپ کیا اب بھی اس کے چانس تھے کہ پارٹ II میں بھی وہی ٹاپ کرے گا۔ ''رابی زوّار پھر کیا کروں؟ مما، پاپا گھر میں سب پوچھ رہے ہیں کہ رابی کیا کہتی ہے۔ کب چلیں اس کے ہاں؟'' میں خاموش رہی۔

مجھے پتہ تھا۔ اب اس نے کیا کچھ کہنا ہے۔ میں پچھلے چھ ماہ سے سنتی آ رہی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہاں تھا اور اپنے مما، پاپا کو میرے گھر والوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ میں اسے کوئی جواب نہ دے پاتی۔ بس پتھر ہو جاتی اور خاموشی سے زمین پر نظریں گاڑ دیتی۔ میرے پاس کوئی بھی تو جواب نہ تھا۔ ابا نے کہا تھا۔ رابی بیٹی لاہور پڑھنے جا رہی ہو تو ہماری عزت کا خیال رکھنا اور میں نے بڑی ایمانداری سے ان کی عزت سنبھال رکھی تھی۔ بخیر و عافیت ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میں خوش تھی کہ سب کہانیاں ہیں بھلا یونیورسٹی میں کب کہانی جنم لیتی ہے۔ مجھے یہ خوشی راس نہ آئی اور ایک دن ارسل مجید نے مجھے اپنی مما سے ملوایا۔ ''مما یہ رابی زوّار ہے'' میں نے سلام کیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ارسل کو دیکھ کر مسکرائیں۔ بولیں۔ ''یہ تو گڑیا سی ہے۔ بہت سنبھال کر رکھنے والی۔'' پھر انہوں نے مجھ سے میرے گھر اور اہلِ خانہ کے بارے میں پوچھا۔ میں سرسری سا بتاتی رہی۔

میرے ہوش تو دوسرے دن اُڑے۔ جب ارسل مجید نے کہا کہ میرے مما پاپا تمہارے کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے درشتی سے کہا۔ ''کیوں؟ میں نہیں چاہتی کوئی میرے گھر آئے۔ تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ بولا۔ ''مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ میں کئی بار ان گلیوں، سڑکوں اور پگڈنڈیوں کو دیکھ آیا ہوں۔ جہاں سے تم گزرتی ہو۔ مگر میں تمہاری مرضی کے بغیر نہیں بھیجنا چاہتا۔ کیا میں اس قابل نہیں کہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے اس کے جوتوں پر نظریں گاڑے رکھیں اور کہا۔

''ایسی بات نہیں۔ بس میں نہیں چاہتی۔ میرے گھر کوئی یہاں سے جائے مجھے اپنے ابا کی عزت سنبھالنی ہے۔ ورنہ سب خاندان والے کہیں گے کہ بیٹی نے اپنا بر تلاش کر لیا۔ خوب بھئی پڑھائی کے ساتھ یہ کام بھی کر لیا۔'' میں سوچ کر ہی کانپ اُٹھی۔

وہ شاید ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ بولا۔ ''ابھی سیشن ختم ہونے میں کافی وقت پڑا ہے۔ آپ سوچ لیں۔ گھر مشورہ تو کریں۔'' اب میں اسے کیا بتاتی کہ میری اَن پڑھ ماں نے تو آسمان سر پر اٹھا لینا تھا کہ ابا کی چہیتی نے کیا چاند چڑھایا۔ اور اولاد اپنے ماں باپ کو اپنے

ماحول کو بہتر سمجھتی ہے۔

ہماری ڈیٹ شیٹ آ چکی تھی۔ کتابیں ہمارے سر پر سوار رہتی اور کوئی ہوش نہ تھا۔ ہاسٹل کے در و دیوار دیکھ کر دل دکھی ہوتا کہ اب ہم نے جلد ہی یہ سب چھوڑ جانا ہے۔ یہ ہنسی، شرارتیں، چھیڑ چھاڑ سب ہم سے رخصت ہونے والی تھی۔

موسم اَبر آلود تھا۔ کچھ نوٹس بنانے تھے۔ میں اس لیے لائبریری چلی آئی تھی۔ مگر یہاں بھی ارسل مجید کو دیکھ کر میں واپس پلٹ آئی تھی۔ آخری کلاس لی اور ابھی بیٹھی ہی تھی کہ مجھے اکیلی دیکھ کر آج پھر وہ جواب طلب کرنے چلا آیا۔

''رابی پلیز میرے حق میں فیصلہ کرتے وقت کون سی مجبوری آڑے آتی ہے۔'' میں نے اسے دُور سے آتا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے زمین پر نظریں گاڑ دیں کہیں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر میں پگھل نہ جاؤں۔ وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔

''رابی تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے دکھی کر کے تم خوش رہو گی؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے......آزمالینا......زندگی بھر پچھتاؤ گی......'' میں کچھ نہ بولی۔ کیونکہ میں پتھر کا بت بن گئی تھی۔ وہ واپس مڑا اور اولڈ کیمپس کا گیٹ پار کر گیا۔ اچانک میں پتھر سے بُھر بھری مٹی کا ڈھیر ہو گئی۔ ذرا سی ہوا چلی اور میں اڑتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ مگر اسے نہ پاسکی۔

آخری پیپر دے کر جس دن میں گھر لوٹنے لگی۔ اس نے پھر میرا رستہ روک لیا۔ رابی میں انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے۔ کہ میرے علاوہ کوئی تمہارے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتا۔

اپنے بڑے بھائی کی شادی پر مہندی کا تھال پکڑے سواتی بلیک فراک پہنے گھٹنوں تک لمبے بال کھلے چھوڑ کر میں نے خوب ڈانس کیا۔ میری خوبصورتی اماں کے لیے باعثِ غرور ہو گئی۔ جو بھی رشتہ آتا اماں کی نظر میں نہ ٹھہرتا۔ یوں سال کے بعد سال گزرنے لگے۔ میری تمام کلاس فیلوز کی شادیاں ہو گئیں۔ اب رشتے آنے بند ہو گئے۔ لوگ کہنے لگے۔ رابی تو اچھی ہے۔ مگر ماں نک چڑھی ہے۔ اس نے بیٹی کو نہیں بیاہنا۔ میں نے جاب کر لی۔ ہر 31 دسمبر کو ایک خالی کارڈ جس پہ ایک فون نمبر لکھا ہوتا......آتا۔ میرے جنم دن اور نئے سال کی مبارکباد۔ میں کئی کئی دن دیکھتی رہتی۔ الماری کے ایک کونے میں سنبھال رکھتی۔ چار سال گزر گئے۔ اب میرے بالوں میں چاندی اُگنے لگی۔

اماں رشتہ والی کو کہتی۔ لوگ آتے۔ میں سنورتی۔ چائے دیگر لوازمات کے ساتھ پیش کرتی۔ مہمان چلے جاتے۔ پھر کوئی جواب نہ آتا۔ کوئی کہتا لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔ کوئی کہتا۔ گھر کا ماحول دقیانوسی ہے۔ باپ اچھا ہے۔ ماں کا مزاج ٹھیک نہیں۔ یہ سب باتیں میں سنتی اور چپ رہتی۔ ایک شام میں دفتر سے آ کر چائے لے کر چھت پر جانے لگی تو چھت سے آتی اماں کی آواز نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میری اماں کہہ رہی تھی۔ ''رابی پر نحوست کا سایہ ہے۔ رابی کے ابا، کسی پیر سے علاج کرائیں۔'' ابا بولے۔ ''بھلی مانس تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میری پڑھی لکھی بیٹی ہے۔ ایسی جاہلانہ باتیں نہ کرو۔ میرے رب کے حکم سے ہو رہا ہے سب۔''

میری آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ مجھے اپنے آس پاس دھواں ہی دھواں دکھائی دینے لگا۔ میں پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چائے مجھے نمکین سی لگی۔ میرا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہا۔ مگر میں رو نہ سکتی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں بھابی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی رابی کا رشتہ ہونے سے رُکوا رہا ہے۔ اب میرا دھیان ارسل مجید کی طرف گیا اس نے کہا تھا۔ آزمالینا۔ میرے علاوہ کوئی تمہارے ساتھ نہیں چلے گا۔ میں سوچ رہی تھی کہ واقعی کہیں ایسا تو نہیں۔ اس کی محبت میرے پاؤں کی زنجیر تو نہیں مگر میں نے فوراً ہی اس

سے دھیان ہٹا لیا کہ اب تو وہ بچوں والا ہوگا۔ پھر میرا دھیان کارڈز کی طرف گیا۔ میں نے الماری سے نکال کر دیکھے۔تو ہر کارڈ کی Back پر A.M لکھا تھا۔''ارسل مجید'' یہ نام میرے وجود کو ہلا گیا۔ میں کارڈ پکڑے کرسی پر ڈھے گئی۔روتے روتے ارسل کو اپنے رب سے مانگنے لگی۔ پھر جانے کب خواب آنکھوں میں اتر آئے......سب کچھ آناً فاناً ہوا۔کارڈ چھپ گئے۔نکاح کے وقت اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مجھے مولوی صاحب کا صرف اتنا کہنا سنائی دیا۔ بولو بیٹی قبول ہے؟ میں نے سر جھکا دیا اور رخصتی کے وقت ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا میں رو پڑی کہ مدت ہوئی ابا تیری بانہوں کا جھولا لیے ہوئے آج ابا کے بازوؤں میں سمٹی میں کسی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی اور شکر ادا کر رہی تھی کہ اللہ نے میری عزت رکھ لی۔ میں نے اپنے ابا کی عزت پر آنچ نہ آنے دی۔ مگر دل میں ایک کسک سی تھی کہ مائیں پڑھی لکھی ہوں تو بیٹیوں کے نصیب کے پھول کھلتے دیر نہیں لگتی۔

میں گاڑی میں بیٹھی ،نظریں جھکائے ہوئے تھی سارا رستہ خاموشی سے کٹا۔اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جانے کیوں مجھے ارسل مجید بڑی شدت سے یاد آیا۔ میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے پھولوں سے سجے،خوشبو سے مہکے کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں باہر نکل گئی۔ میری گردن جھکی جھکی تھک گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ میری یونیورسٹی کی زمانہ طالب علمی کی تصاویر پوسٹر سائز میں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ میرا دل گھبرانے لگا کہ کون ہوسکتا ہے۔ کہیں کوئی ایسا تو نہیں۔ جو میرے اور ارسل مجید کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرا دماغ گھوم گیا اور میں دھڑام سے زمین پر آ گری۔اچانک دروازہ کھلا تو کوئی بھاگا ہوا میری طرف آیا کیا ہوا؟ یہ ارسل مجید کی آواز تھی۔مگر میں اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی جب آنکھ کھلی تو دیکھا۔سب میرے اردگرد کھڑے ہیں۔سب سے پہلی نظر میری ارسل مجید پر پڑی۔ وہ بولا۔ دیکھا مما یہ ہے ہی ڈرپوک بلی۔اس کے مما پاپا ہنس پڑے۔مما نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا۔میرا ماتھا چوما۔ مجھے بڑا اچھا لگا۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ میرے پاؤں زمین پر پڑتے ہی نہ تھے۔اڑتی پھرتی تھی۔

اگلے دن ولیمہ تھا۔Couples میں ارینج تھا۔آج ہمارے بہت سارے کلاس فیلوز نے بھی آنا تھا۔ارسل مجھے چھیڑتے...... یار تیری وجہ سے میں لیٹ ہوگیا۔ ورنہ میرے بھی دو تین بچے ہونے تھے۔اب سب اپنے بچے لے کر آئیں گے۔ میں ہنستی جارہی تھی ۔میں بڑے عرصہ بعد ایسے ہنسی تھی۔رات کو میں پارلر سے تیار ہو کر آئی تو مما نے مجھے سینے سے لگا لیا۔اللہ نظر بد سے بچائے......آمین۔

سب کلاس فیلوز نے خوب ہلا گلا کیا۔ہم سب یوں تھے۔جیسے ابھی ابھی اپنے کلاس روم سے اُٹھ کر آئے ہیں۔ جب کسی کا بچہ روتا یا ہاتھ کھینچتا تو معلوم ہوتا کہ نہیں وقت سرک گیا ہے۔رات ڈھلتی جارہی تھی۔سب دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھروں کو لوٹ گئے

۔

اگلے دن مجھے اماں،ابا کے ساتھ جانا تھا۔مما نے بہت کہا کہ چھوڑیں یہ رسم و رواج۔اب بچوں کو انجوائے کرنے دیں۔مگر اماں نہ مانی۔جب نکلنے لگے تو اماں بولیں۔

''بہن جی! رابی کی جھولی میں مٹھائی ڈال کر رخصت کریں۔یعنی پانچ کلو مٹھائی کا ٹوکرا۔'' ارسل نے سُنا تو فوراً گاڑی لے کر نکل گئے۔ابا نے کہا بھی۔

''کیا ضرورت ہے مٹھائی کی۔'' مگر اماں بولیں!

''ہم نے برادری کو بھی منہ دکھانا ہے۔'' آخر کو باتیں بنیں گی۔بہن جی آپ برا نہ ماننا ہمارے ہاں دلہن کے ساتھ مٹھائی ہوتی ہے۔اچھا شگون ہوتا ہے......ورنہ باتیں بنتی ہیں......کہ لو پہلی پہلی بار بھی بہو کو خالی میکے بھیج دیا۔'' سچ پوچھیں تو میں بھی جانا نہیں چاہتی

تھی۔

اماں کی جاہلانہ باتوں سے میری طبیعت پر بوجھ پڑ جاتا تھا۔مگر میں بحث نہ کرتی کہ اماں نے کہہ دینا تھا......''کہ یونیورسٹی میں لڑکیاں پڑھ کر منہ زور ہو جاتی ہیں۔''

ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔میں اپنے ہاتھوں پر لگی مہندی دیکھتے ہوئے مسلسل ارسل کا سوچ رہی تھی۔میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا۔اب میں ارسل سے ٹوٹ کر محبت کروں گی۔اسے کبھی نہیں ستاؤں گی۔اب جا کے واپس آؤں گی۔تو کبھی نہیں میکے جاؤں گی۔اچانک پاپا کے موبائل پر بیل ہوئی۔

پاپا فون سنتے ہی باہر کو دوڑے۔مما بھی پریشانی میں جانے لگیں تو میں مما کے پیچھے بھاگی۔مما کیا بات ہے؟''ارسل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔وہ ہاسپٹل میں ہے......'' مجھے بھی لے چلیں۔میں پریشان مما کے پیچھے گاڑی میں جا بیٹھی۔

ارسل نے آج مجھے اسپیشل تیار ہونے کو کہا تھا۔میں نے پنک اور وائٹ شرارہ پہنا تھا۔ساتھ ماتھے پر سلور بندیا لگائی ہوئی تھی۔سلور ہی چپل پہنی تھی۔ارسل کو چوڑیاں بہت پسند تھیں۔

اب مجھے اپنی اماں پر غصہ آ رہا تھا بھلا مٹھائی کے بغیر نہیں میں جا سکتی تھی۔اتنی بھی برادری،خاندان کی کیا پروا......کہ اپنی زندگی ہی تنگ کر لو۔خود کو پریشان کر لو۔پھر میں ارسل کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

مما مجھ سے پہلے ہی اتر کر بھاگ گئیں۔پیچھے میں بھی لپکی ہاسپٹل میں مجھے بنا ٹھنا دیکھ کر ہر کوئی حیران۔ابھی تو مہندی کی خوشبو بھی میرے ہاتھوں میں رچی ہوئی تھی۔سیڑھیاں چڑھنے میں مجھے اپنی فینسی چپل کی وجہ سے مشکل ہو رہی تھی۔میں نے چپل اتار کر ہاتھوں میں پکڑ لی۔اماں بولیں۔

''رابی پیروں میں پہنو۔لوگ کیا کہیں گے تمہیں کپڑے چینج کر لینے چاہیے تھے۔''

میں نے اماں کی باتوں پر کان نہ دھرے۔برآمدے میں بھاگتی ہوئی مما کے پیچھے گئی۔

مما کی چیخ نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔نہیں میرا بیٹا ارسل مجھے یوں نہ چھوڑ کر جاؤ۔

میں دروازے میں ہی کھڑی ہاتھ میں جوتے پکڑے میرا زرتار دوپٹہ میرے سر سے پھسل گیا۔واقعی میری چادر کھینچ لی گئی۔میرا محبوب مجازی خدا مجھے پا کر اکیلا چھوڑ گیا۔

میں نے خونی نظروں سے اماں کو دیکھا اور بلک پڑی۔''اماں یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' میں اتنا ٹوٹ کر روئی کہ ہسپتال میں ہر کوئی مجھ نئی نویلی دلہن کو بیوہ ہوتا دیکھ کر رو دیا۔

میں چکنے فرش پر پھسل کر منہ کے بل گری۔میری پیشانی سے خون پھوٹ پڑا۔خون میرے سفید اور پنک سوٹ کو سرخ کرنے لگا۔میری چوڑیاں کرچی کرچی ہو کر میرے بازوؤں کو زخمی کر گئیں میں چوڑیوں کی کرچیوں کے اوپر سے بھاگ کر ارسل کی طرف لپکی۔چوڑیوں کی کرچیاں میرے پیروں میں چبھ گئیں۔میرے پیروں سے خون بہنے لگا۔ہسپتال کے سفید ماربل کے فرش پر میں جہاں مہندی لگے پاؤں رکھتی فرش سرخ ہو جاتا۔میں پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔مجھے لگا......اب میں بھی ارسل کے ساتھ ہی مر جاؤں گی۔میں نے زندہ رہ کر کیا کرنا۔ابھی تو میں نے اس کی محبتوں کے جواب دینے تھے۔اس سے برتی بے اعتنائی کی معافی مانگنی تھی۔اب میں کیا کروں یا اللہ۔تُو مجھے بھی مار ڈال۔

پاپا اور ابا نے مجھے پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا۔اماں اور مما کے ساتھ گھر بھیجا۔مما کی حالت بہت بری تھی۔مجھے ایسے لگتا تھا کہ میں ان

کے بیٹے کی قاتل ہوں۔ میری اماں کی بے جا فرمائش نے ان کا بیٹا چھین لیا۔

وہ بیکری سے مٹھائی کا ٹوکرا لے کر گاڑی میں بیٹھنے لگے تو اچانک ایک گاڑی ان سے آ ٹکرائی اور دو شرابیوں کی بدمستیوں کے ہاتھوں ایک گھر کا چراغ اور میرے ماتھے کا جھومر چھن گیا۔ میں کتنے گھنٹے بے ہوش رہی۔ کچھ نہیں پتہ۔ البتہ ہوش آتے ہی میرا دل بند ہونے لگا۔ ابھی تو میں نے پوچھنا تھا، کہ ارسل آخر تمہیں مجھ میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا، جو میرا اتنا انتظار کیا۔ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں کوندا۔ ہاں میں واقعی منحوس ہوں میری نحوست ارسل کو میرے محبوب کو کھا گئی۔

میرے پیچھے کسی نے کہا۔ ''بس اللہ کی کوئی مصلحت ہے۔ اس کی مرضی۔ انسان کی کیا مجال......'' میں تڑپ اٹھی۔ ''مجھے سہاگن سے بیوہ کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ مجھ سے میری محبت چھن گئی......'' صدمہ سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ میں اُٹھ کر ارسل کے پاس آ بیٹھی۔ میں اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بلک اٹھی۔ ''ارسل اب میں کیا کروں گی۔ میرے اللہ! تُو معجزہ کر دے میرے ارسل کو زندگی دے دے۔'' میں سسکیاں لے رہی تھی......

نہ جانے کب روتے روتے کرسی پر بیٹھے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے اپنے بازوؤں میں رنگ برنگی چوڑیاں قوسِ قزح کے سب رنگ بکھیرتی نظر آئیں...... میں ایک جھٹکے سے اٹھی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مؤذن کی آواز نئی صبح کا پیام دے رہی تھی۔ میں اٹھی اور وضو کرنے چل دی۔ مجھے اپنے مالک کا شکر ادا کرنا تھا۔ اس نے مجھے فیصلہ کرنے کی ہمت دے دی تھی کارڈ پہ لکھا ارسل کا فون نمبر جگمگا اٹھا...... باہر صحن میں دانہ چگتی چڑیوں کی چہچہاہٹ مجھے بہت انوکھی لگی...... میں نے ابا کو چائے دیتے ہوئے وہ سب کہہ ڈالا جو خود سے کہتی بھی ڈرتی تھی۔ نئی صبح کے سورج کی پہلی کرن مسکراتے ہوئے چڑیوں سے کھیلنے لگی۔

O......❖......O

نیم اور بیری

عورت جو حوا کی بیٹی، وفا کی دیوی، محبت کا پیکر اور موم کی گڑیا ہے۔ محبت سے جس سانچے میں ڈھالو۔ ڈھل جاتی ہے۔
بابل کے آنگن میں بیری اور نیم کے درخت کا جھولا جھولتی، نیم کی پتلی سی ٹہنیوں کو جھلاتی ہوئی، لہراتی ہوئی اپنا بچپن گزار دیتی ہے۔ ننگے پاؤں دھول اُڑاتی آنکھ مچولی، پکڑنے اور بھاگنے کا کھیل کھیلتے ہوئے اسے پتہ ہی نہیں چلتا کب وہ بھی بیری کے درخت کے ساتھ ساتھ بڑی ہوگئی۔ بیری کو کچے کچے بیر لگے اس کے پاؤں میں جوتا چھوٹا ہوگیا۔ گلابی پھولوں والی کھلی سی فراک تنگ اور چھوٹی ہوگئی۔ وہ بھاگتی پھرتی تو اماں اُسے دیکھ کر نہال سی ہو جاتی۔ دادی سو بار منہ چومتی۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی بھاگی پھرتی ننھے منے پاؤں گیلے کر کے مٹی میں پاؤں کے نقش چھوڑتی نیم کے تنے کے ساتھ جھول جھول جاتی۔ ہنستی تو ہنستی چلی جاتی۔ بالوں کی لٹیں بکھر بکھر جاتیں۔ ہر کوئی اسے پکڑ کر گول گول چکر دے ڈالتا۔ وہ چکرا کر رہ جاتی۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی اور ہلکے ہلکے جھوم جاتی۔ دادی نہانے کے لیے نل سے پانی کی بالٹی بھر کر رکھتی۔ اندر کپڑے اٹھانے جاتی تو وہ بالٹی کے پانی میں زور زور سے ہاتھ مارتی۔ چھینٹے اڑاتی، فراک گیلی کرتی، پانی میں چھپ چھپ کرتی، بھاگتے بھاگتے دادی کے اوپر بھی بالٹی سے پانی اچھالتی۔ دادی غصہ ہوتی مگر......وہ کب ہاتھ آتی۔ رات کو سونے سے پہلے دادی کی گود میں آ گھستی اور شہزادہ، شہزادی کی کہانی سنتی سو جاتی۔ دادی پیشانی پر گرے بالوں کو ہٹا کر چوم لیتی۔ اماں اسے لینے آتی تو کہتی؟ ''بی بی اب یہ اٹھائی نہیں جاتی۔ سونے نہ دیا کریں۔ کہانی سنا کر میرے پاس بھیج دیا کریں۔'' مگر وہ سنتی ہی کب تھی۔
ہر روز کہانی میں شہزادہ، شہزادی کو جب جن کی قید سے چھڑانے آتا۔ شہزادی، شہزادہ کو دیکھ کر خوش ہوتی اور وہ سونے میں دیر نہ کرتی۔ دادی اسے سکون سے سوتا دیکھ کر بے اختیار چومتے ہوئے۔ ''سدا خوش رہنے'' کی دعا دے ڈالتی۔
وہ بیر اٹھا کر کھاتی ہوئی سوچتی۔ ''پتہ نہیں سب کو کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت دادی اور اماں ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔ ایسے نہ بیٹھو، دوپٹہ لیا کرو، کھی کھی نہ کرو۔ بھاگ کر ابا سے نہ چمٹا کرو۔ کم بولا کرو۔ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ کام بھی کیا کرو۔'' یہ باتیں اسے ہر روز ہی سننی پڑتی تھیں......چھوٹی چاچی کا علی جو بچپن سے اس کے ساتھ کھیلا۔ اپنی گڑیا، گڈے کی شادی کے بہت سارے کام اس سے کرواتی۔ نیم کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے اس نے علی سے گڑیا کے بہت سے زیور بنوائے تھے۔ علی ہر فن مولا تھا۔ بگڑے کاموں کو سنوارنا اسے خوب آتا تھا۔ پہلے چاچی آتی تو اماں کہتی! ''گڑیا جاؤ علی کے ساتھ کھیلو۔'' اب اماں اور دادی بہت بدل گئی تھیں۔ وہ علی کے ساتھ کوئی بات کر کے ہنستی تو دادی ایسی خونخوار نظروں سے دیکھتی کہ گڑیا کو دادی جلاد لگتی۔
بہار آئی تو نیم اور بیری کے درخت پر نئے نئے نرم نرم نازک پتے پھوٹنے لگے۔ گڑیا نے اپنا جھولا کھول کر جھولنے کی کوشش کی تو رسی ٹوٹی اور......دھڑام سے گری۔ علی جو ابھی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اسے گرتا دیکھا تو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ دادی علی کی آواز سن کر

باہر آئی۔ گڑیا کو وہ لتاڑا کہ خدا کی پناہ......گڑیا نے اپنے کپڑوں سے مٹی جھاڑی اور اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ اس نے آئینہ میں خود کو دیکھا تو سمجھ گئی وہ واقعی اب چھوٹی نہ رہی تھی۔ اب تو آئینہ بھی چھوٹا پڑ گیا تھا۔ پھر وہ خود بخود سنجیدگی کا لبادہ اوڑھنے لگی شرارتیں کہیں اور چل دیں۔ ہنسی بھی کہیں کھو گئی۔

ابا باہر سے آتے تو اس کی ایڑھیاں بھاگنے کو اٹھتیں۔ مگر وہ ''سلام ابا'' کہہ کر پانی کا گلاس بھر لاتی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے دعا دیتے۔ ''خوش رہو۔'' اسے یوں لگتا سارے جہان کا سکون اندر اتر آیا ہو۔ گڑیا نے سنجیدگی کی چادر کیا اوڑھی۔ جلدی جلدی سال گزرنے لگے۔ اس نے میٹرک بھی کر لیا۔ وہ بلا کی ذہین تھی۔ ایک دفعہ مضمون دیکھتی۔ اسے یاد ہو جاتا وہ گرمیوں کی ساری دوپہریں نیم کے نیچے پڑھتے پڑھتے گزار دیتی۔ کبھی کبھی وہ پڑھنا چھوڑ کر نیم کے پتوں سے باتیں کرتی۔

''دیکھو میں کتنا بدل گئی ہوں۔ میرا اب بھی دل چاہتا ہے کہ میں تمہاری ٹہنیوں کو پکڑ کر جھول جاؤں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اماں کہتی ہیں میں بڑی ہو گئی ہوں۔ سنو......نیم! علی تو ویسے کا ویسا ہے۔ اُسے تو کوئی نہیں کہتا۔ تم بڑے ہو گئے ہو۔''

ایک دن اس نے دادی کو کہتے سنا۔ ''تیمور پتر! بیری اور بیٹی کو بڑھتے دیر نہیں لگتی۔ پتہ تو اس وقت چلتا ہے۔ جب بیری پر پتھر آ کر گرنے لگتے ہیں۔ گڑیا کے بیاہ کی فکر کر۔ دیر نہ کر......وقت نے رنگ بدل لیا ہے......بہت بدل گیا ہے وقت......'' دادی پل پل بدلنے والے زمانہ کے مزاج سے عاجز تھی۔

اس دن اسے ابا پہ بہت ترس آیا۔ خود پہ غصہ بھی......اچھا بھلا ابا فکر مند ہو گیا۔ چپ سا ہو گیا۔ ابا کے کندھے جھکے اور جھکتے چلے گئے۔ دُکھ کی لہر دل میں آ کر ٹھہر گئی۔ ''میرا تو کوئی ویر بھی نہیں جو ابا کا سہارا بنے۔ پتہ نہیں کیوں بیٹی باپ کا سہارا نہیں بن سکتی......شاید اسے پرائے گھر جانا ہوتا ہے۔''

عجیب ہی ہیں......دنیا کے رسم و رواج......معاشرتی روایات......عورت لڑکا اور لڑکی دونوں کو جنم دیتی ہے۔ سینے سے لگا کر پالتی ہے۔ جینا سکھاتی ہے پھر دونوں کے لیے زندگی مختلف کیوں......؟ زندگی تو ایک ہی ہے......مرد اور عورت کے جینے کے انداز الگ الگ کیوں......؟ دونوں زندگی کے ساتھی ہیں۔ ایک حکم دے......دوسرا صرف مانے......سر تسلیم خم کرے کیوں......؟ عورت حکم کیوں نہیں دے سکتی۔ مرد ماننے والا کیوں نہیں ہو سکتا......؟ کیا زندگی صرف مرد کو ہی گزارنی آتی ہے......کیوں؟ کیا عورت عقل میں کمتر ہے......؟ عورت تو زیادہ محتاط ہوتی ہے......عورت کی مرضی کے بغیر کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ اسے اپنی حفاظت خود کرنی آتی ہے۔ وہ چاہے تو سب فتح کرے......چاہے تو ہار جائے وہ تو جان بوجھ کر ہار جاتی ہے مرد سے......تا کہ اسے عورت کی محبت کا یقین رہے۔ اپنی مردانگی کا گھمنڈ رہے۔

وہ بچپن میں بھائی سے اس لیے ہار جاتی کہ بھائی یہ سمجھتا رہے کہ مجھ سے زیادہ بہن کا محافظ کوئی نہیں......عورت کو بھلا کوئی سمجھ سکتا ہے......؟ کوئی نہیں......وہ جسے چاہتی ہے......محبت کرتی ہے......ہمیشہ اس کے پاؤں کی دھول بنی رہتی ہے۔ مگر اس کے عورت پن کو لتاڑا جائے اسے ٹھکرایا جائے......ذلیل کیا جائے تو اس عورت سے ظالم ترین کوئی نہیں......

پھر عورت تو مرد کو اس وقت سہارا دیتی ہے۔ بہادر بناتی ہے۔ حوصلہ دیتی ہے۔ جب وہ ہارنے لگتا ہے۔ اندر ہی اندر مرنے لگتا ہے۔ وہ ہار کر اسے جیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ اپنی محبت سے اسے دلیر بناتی ہے اور زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینا سکھاتی ہے۔ پھر کبھی کبھی کیوں مرد، عورت کو کمتر سمجھ بیٹھتا ہے۔

گڑیا نے شعور و آگہی کے اسباق کیا پڑھے۔ اکثر ہی اپنی سوچ کے تانے بانے میں الجھی رہتی۔ ایک دن اسے پتہ چلا اس کا بیاہ

ہو رہا ہے۔ اسے یہ سمجھایا گیا۔ تمہیں اب اور بدلنا ہے۔ اب تم بیٹی نہیں رہو گی۔ بہو بننے جا رہی ہو۔ بہو یا کوئی اور مخلوق......؟ اسے یہ نہیں بتایا کہ کسی کے دل کی ملکہ بھی بنو گی۔ کوئی خواب نہ دکھایا گیا۔ شاید ماں جانتی ہے کہ خواب ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔

اس نے ایک اور سنجیدگی کی گوڑھے رنگ کی چادر اوڑھ لی۔ روتے ہوئے بھی مسکرانا سیکھ لیا۔ اب دادی خوش تھی کہ اس نے گڑیا کو وہ تمام گُر سکھا دیئے ہیں جس سے وہ پیا گھر راج کرے گی۔ لمبے سیاہ بال، سفید اُجلی رنگت، مسکراتی ہوئی آنکھیں کیسے نہ دُلہا میاں کو اسیر کریں گی۔

دادی نے بڑی سوچ بچار کے بعد ساتھ والے گاؤں کے زمیندار کے بیٹے کا رشتہ پسند کر لیا تھا۔ تجربہ کی سفیدی بالوں میں سجانے والی دادی نے علی کی آنکھوں کی التجا کو بھی رد کر دیا۔ وہ تو شاید بچپن سے ہی گڑیا کو شہزادی بنا دیکھنا چاہتی تھی۔

سرخ دوپٹہ اوڑھے اس نے نکاح پڑھاتے مولوی صاحب کے سامنے تین بار سوالیہ انداز میں ''جی'' کچھ ایسے کہا جیسے پوچھا ہو......''کیا؟''

مولوی صاحب کو اتنے علم کے باوجود بھی نہ سمجھ آئی کہ بچی ہاں بول رہی ہے یا کچھ پوچھ رہی ہے......

سرخ زرتار بھاری دوپٹہ کے اندر گٹھڑی بنی گڑیا سوچتی رہ گئی۔ کیا ایسے ایک دوسرے کو قبول کیا جاتا ہے۔ میرا تو دل مانا ہی نہیں حالانکہ تین ماہ سے وہ اپنے دل سے لڑ رہی تھی۔ اسے سمجھا رہی تھی۔ ''اے دل! تم مجھے باغیانہ سوچ کی طرف مت لاؤ۔ تمہیں نہیں پتہ میں ایک عزت دار گھر کی دھی ہوں۔ جس کا کام اپنے بڑوں کا مان رکھنا ہے۔''

''میں نے تو کوئی خواب دیکھا ہی نہیں۔ سچی سے علی تو بس میرا بچپن کا ساتھی ہے۔'' اس نے اس خواب سے نظریں چُرا لیں۔ جس میں وہ شہزادی اور علی شہزادہ بن کر اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا۔

وہ حیران تھی۔ دادی ایک جہاں دیدہ عورت ہو کر بھی میری روح کی سرشاری جو علی سے وابستہ تھی نہ جان پائی۔

جب مغرور سا چوہدری حمزہ اس کا سفید مرمریں ہاتھ تھام کر گاڑی کی طرف لایا تو اس نے پیچھے مڑ کے نیم اور بیری کے درخت کو دیکھا دونوں رو رہے تھے۔ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے ان سے التجا کی میری گڑیا جو میں نے تمہارے تنے میں چھپا دی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ ابا اور دادی اس وقت بھی نہ جان پائے گڑیا چوہدری حمزہ کے ساتھ نہیں علی کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اماں نے روتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا......وہ سب جانتی تھی......

جو گڑیا نے کبھی نہ کہا......مجبور ماں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں علی کی طرف اشارہ بھی کیا تھا......مگر دادی اور ابا کے سامنے کوئی نہ چل سکی۔ گڑیا کا دل چاہا اماں اسے اپنے بڑے سارے دوپٹہ میں چھپا لے اور پھر وہ کسی کو دکھائی نہ دے۔ اماں گڑیا کو پھولوں سے سجی گاڑی کی طرف لائی۔ ماتھا چوم کر کہا۔ ''رب کے حوالے میری دھی۔''

چوہدری حمزہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنے دوست کو آنکھ ماری۔ بڑا فحش انداز تھا۔ نئے رشتے، نیا ماحول، بہت بڑا گھر، کمرے ہی کمرے جیسے جیل۔ کسی بھی کمرے کے باہر نیم اور بیری کا درخت نہ تھا۔ مصنوعی پودے مصنوعی ماحول۔ ایک بڑے پنجرے میں لمبی سی دُم والا طوطا اسے مٹک مٹک کر دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی آواز میں وہ چہکار نہ تھی۔ جو گڑیا کے صحن میں بیری کے درخت پر چہکتی چڑیوں کی تھی۔ وہ کسی کی پابند نہ تھیں۔ اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ جب چاہتیں چُوں چُوں کرتیں۔ پھر سے اُڑ جاتیں۔

دادی کی عقل مندی، سکھ پانے کے فارمولے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کا من موہ لینے والا روپ چوہدری حمزہ کو کیسے اسیر کر پاتا۔ وہ تو شراب کے نشہ میں چُور اس کے پاس آیا۔ اسے کیا پتہ عورت کے دل کو کیسے جیتا جاتا ہے......؟ عورت کو رام کیسے کیا

جاتا ہے......؟

وہ تو اپنی ہوس کا اسیر تھا۔ اس نے اسے ایک پھول کی طرح مسل کر پھینک دیا۔ معصوم سی گڑیا جو نیم اور بیری کا ایک ٹوٹا پتہ بھی دیکھ کر لرز جاتی۔ آج خود چھلنی بن گئی۔ اوباش طبیعت کا مالک چوہدری حمزہ جو عورت کو ایک کھلونا سے زیادہ نہ سمجھتا۔ اس کی روح کو تار تار کر ڈالا۔ سمجھداری کا پانی گھونٹ گھونٹ پیتی گڑیا نے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر سب کو یقین دلایا۔ وہ بہت خوش ہے سامنے بیٹھی دادی آج اسے بہت بری لگی۔ اور اماں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ٹھہرا نمکین پانی باہر آنے کو بے تاب ہوا تو پلکوں کو جھکا لیا۔

اماں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ گڑیا کی کلائی میں چوڑیاں چُبھ کر اپنا نشان چھوڑ گئیں۔ زخم محبت کے نہیں کسی اذیت کے نشان تھے۔ اماں پوچھتی پوچھتی چُپ ہو رہی۔ گڑیا کا دل بھر آیا۔ ''اماں اپنی روح کے زخم کیسے دکھلاؤں......'' علی دور کھڑا اس کا پُرسوز سجیلا روپ دیکھ کر مرعوب ہو گیا۔ گڑیا تم اسی شان وشوکت کے اہل تھی۔ میں تمھیں یہ سب نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا۔

معاشرے کے کرتا دھرتا سے کوئی پوچھے......عورت یہ سب کب مانگتی ہے۔ وہ تو صرف من کی محبت مانگتی ہے۔ من کی......روح کی شانتی۔

وہ تو صرف اسے مانگتی ہے۔ جو اس کی روح کا طالب ہو۔ دل کی راحت......ورنہ بچے تو وہ ان چاہے من سے بھی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر روتی کُرلاتی روح کے ساتھ......خوشی سے نہیں......مر مر کر جنم دیتی ہے۔ پھر ممتا تو ویسے ہی کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ پہلے سے مری عورت کو اور مارتی ہے۔ اور مارتی ہے......عورت مرد کے ساتھ چلتی ضرور ہے۔ ساتھ دیتی ہے۔ مگر دل نہیں ہوتا۔ نہ طلب......وہ چل تو کسی اور رستہ پر ہوتی ہے۔ روح کسی اور راہ میں کھڑی ہوتی ہے۔ دوراہا عورت کو مار دیتا ہے۔

عورت زندہ رہ سکتی ہے۔ اگر لڑتی رہے......روتی رہے......چیختی رہے۔

گڑیا نے تو چپ سادھ لی۔ وہ خود کو چوہدری حمزہ کی خواہش پہ قربان کرتی۔ مر جاتی اور رات جیسے ہی دن کی طرف بڑھتی۔ وہ جی اٹھتی اس مرنے جینے نے گڑیا کو اندر باہر سے کمزور کر دیا۔ روح اسے ساتھ لے کر علی کی طرف لپکتی اور اسے زندہ درگور کر دیتی۔ اسی حیات وموت کی کشمکش میں گڑیا کے اندر ممتا پھوٹ پڑی۔ اس نے پہلوٹھی کے بچہ کو ماں کے گھر جنم دینا تھا۔ یہ محض ایک رسم ہے۔ مذہب سے اس کا واسطہ نہیں ہم بہت ہی عجیب سوچ کے مالک ہیں۔ مذہب کو بہت بلندی پہ رکھتے ہیں۔ مگر جب روایت ورسم نبھانے کی باری آتی ہے تو انہیں مذہب پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔

گڑیا اپنے وجود کو بڑی ساری چادر میں چھپا کر نیم اور بیری کے آنگن میں اتری تو سارا بچپن سامنے آ کھڑا ہوا۔ سیدھی ان کی طرف بڑھی۔ ''تم تو بالکل بھی نہیں بدلی۔ اچھا ہوا تم عورت نہیں ہو، کاش میں بھی بیری یا نیم کا درخت ہوتی؟ تُو نے تو مجھے یاد کیا ہوگا......کون یاد کرتا ہے......؟ سب بھول جاتے ہیں۔

نیم کے اندر سے آواز آئی۔ ''گڑیا ہم انسان نہیں جو بھول جائیں۔'' گڑیا نے محبت بھرا ہاتھ دونوں کے پتوں پر باری باری پھیرا۔ اس کا پھولا ہوا پیٹ نمایاں ہو گیا۔ درخت اس کی اُداسی دیکھ کر دکھی ہو گئے۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا......کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ پتے گڑیا پر آ گرے۔ وہ اپنے آنسو چھپاتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اس دن نیم اور بیری چپ چاپ کھڑے رہے۔ آپس میں کوئی بات نہ کی۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ سفید چاندنی نے سارے صحن کو اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ گھر کی پالتو بلی کو نہ جانے کیا بے چینی لگی ہوئی تھی۔ چھت پر چکراتی پھر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ ایک چیخ مار کر روتی تو ابا اپنی

چارپائی کے نیچے سے اپنا جوتا اٹھا کر اسے مارتا۔''اس منحوس نے پتہ نہیں کیا کرنا ہے۔دل دہلا دیتی ہے۔'' دادی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا اور بازو آنکھوں پر رکھ کر سو گئی۔

نیم اور بیری نے دیکھا گڑیا ان کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔دبی دبی سی سسکیاں......اس کا وجود لرز رہا تھا۔انہوں نے سوچا۔ ''کسی روتے کو......خاص کر دکھی عورت کو چُپ کرانا کتنا مشکل ہے......؟

جیسے ہی مسجد سے مؤذن کی آواز نے رات کو الوداع کہا۔گڑیا اٹھی۔وضو کیا اور رب کے حضور جھک گئی۔

صبح ہو چکی تھی۔سورج کا چہرہ بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ماحول میں اداسی رچی ہوئی تھی۔رات سے ہی گڑیا کی طبیعت بے چین تھی رُک رُک کر ہونے والا درد شدت اختیار کر گیا۔دادی نے گرم گرم دودھ دیا تو تکلیف سے گڑیا کو جان نکلتی محسوس ہوئی۔درد بڑھتا رہا۔رُکتا رہا۔پھر درد کی لہریں تیز تیز،جلدی اٹھنے لگیں تو اس کی برداشت جواب دے گئی۔وہ ہائے اماں پکار اٹھی۔''اماں ننگے پاؤں بھاگی۔دادی نے حوصلہ دیا۔اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا اماں گڑیا کو بار بار چومتی۔''یا اللہ میں کیسے اپنی دھی کا درد بانٹ لوں۔'' وہ چکرا کر رہ گئی۔

گڑیا کی نظریں سامنے نیم اور بیری کی طرف لگی تھیں۔بولی۔''اماں میری چارپائی وہاں ان کے پاس رکھنا وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔میرے دکھ کو سمجھتے ہیں اماں مجھے تم اور دادی نہلانا......اماں بھرم رہ جائے گا۔خدارا! ابا سے کچھ نہ کہنا......''

اس نے ٹھہر ٹھہر کر جملے ادا کئے۔اتنے میں لیڈی ڈاکٹر آ گئی۔اس نے فوراً ہسپتال لے جانے کو کہا۔

ساری رات گزر گئی۔گھر میں سناٹا ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھرتا رہا۔عجیب سی بولتی کچھ کہتی ہوئی خاموشی تھی۔اچانک دروازہ زور سے بجا۔دادی روتی چیختی گھر میں داخل ہوئی۔ایک کہرام مچ گیا۔ابا کے آنگن میں بیری اور نیم کے ساتھ ساتھ بڑھنے والی گڑیا ایک اور گڑیا کو جنم دے کر چل بسی۔ابا کے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔نیم اور بیری کے پاس لاڈلی دھی کی چارپائی رکھ دی گئی۔دونوں سا کت کھڑے تھے مگر رو رہے تھے۔اماں گڑیا کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر روئی۔اماں جان گئی تھی کیوں میری دھی کہتی تھی۔''اماں میرا بھرم رکھنا۔''

لیڈی ڈاکٹر نے بے ہوش گڑیا کا نرم و نازک سگریٹ سے داغا وجود۔دادی اور اماں کو دکھایا تھا۔سولی پہ لٹکی میری گڑیا کتنی صبر والی تھی۔اُف نہ کی۔اماں منہ پر دوپٹہ رکھ کر سسکی۔گڑیا مٹی تلے کیا سوئی۔نیم اور بیری سوکھنے لگی۔سب پتے جھڑ گئے۔ابا نے سوچا اب ا نہیں کاٹ ڈالوں۔

مگر......گڑیا کی ''مسکان'' جب ایک دن بھاگتی ہوئی نیم سے لپٹی کھلکھلاتی ہوئی بیری کے ساتھ جا لگی......دونوں نے جیسے انگڑائی لی۔گڑیا کی خوشبو پا کر نیم اور بیری پھر سے جی اٹھے۔ہر روز نئے نئے پتے پھوٹنے لگے......

○......❖......○

دل پہ کب کسی کا زور چلا

وہ کب چاہتی تھی ایسا ہو۔ وہ تو بچوں والی عورت تھی ۔اس کا دل ریختہ ہونے لگا تھا۔دل کیونکر بے لگام ہوا......؟نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے بھلا اس عمر میں کب ایسا ہوتا ہے......

اور اندر سے آواز آئی۔''یہ جذبہ تو وقت اور عمر کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔''

وہ جوں جوں سوچتی خود کو بے بس پاتی۔ ہوا منہ زور ہو جائے اور اٹھا اٹھا کر پٹخے تو بھلا کیا کیا جائے......؟

''کیا کوئی محرومی تھی جس نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا......؟نہیں......شاید ایسا نہیں......''

اندر سے آتی آواز بھی اس کے سامنے سچ بول نہیں رہی تھی ۔

''کیوں ہوتا ہے۔ پھر وہ......جو نہیں ہونا چاہیئے۔''

وہ رات بھر چھت کو تکتی ہوئی سوچوں کے جال میں الجھتی جا رہی تھی گرتی پڑتی ،کوئی رستہ ڈھونڈنے کی کوشش میں اوندھے منہ گرتی تو آنسو اندر لگی چوٹ پہ نمک پاشی کرتے......وہ تکلیف سے بے حال ہو جاتی ۔آنکھیں بند کر لیتی مگر......لا حاصل ۔

جانے کب خواب کا دروازہ وا ہو جاتا۔ وہ قدم دھرتی اور سیڑھیاں چڑھتی چلی جاتی ۔

چاندنی میں نہائی چھت پہ وہ کھڑی ہے یوں دکھائی پڑتا ہے اسے کسی کا انتظار ہے۔کوئی اس کی طرف بڑھتا ہے ۔ وہ سرشار سی ہاتھ تھام لیتی ۔اس کا دل یوں رقص کناں......کہ کبھی اس طور نہ دھڑکا......اُف کیا کیفیت تھی......؟

ایسی مستی اور کیف و سرور کا احساس تو کبھی نہ ہوا۔ وہ کاغذ پر اپنا نام لکھ کر جس کی پابند ہوئی تھی اس نے سو بار ہاتھ تھاما تھا......کبھی زندگی یوں نہ مسکرائی ،نہ وجود کے اندر کوئی جوار بھاٹا اٹھا۔بس اندر خاموشی چھائی رہتی ۔

''یہ کس کا ہاتھ تھامے میں شاہراہِ زندگی پر چوکڑیاں بھرتی بھاگے جا رہی ہوں۔''

وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی ۔سفید دھوئیں اور روشنی کی روش کے آگے اور آگے جانا چاہتی تھی ۔اس نے کچھ کہا۔ وہ چہرہ نہ دیکھ پائی ۔البتہ اس کی باتوں کے سحر میں مدہوش ہوتی گئی ۔خواب کا دروازہ بند ہونے لگا تو اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ وہ سسک پڑی۔

چھت پر چپکی چھپکلی نے اسے گھورا تو دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔عمرِ رفتہ سے پردہ سرکنے لگا۔

اس نے بارہا اماں سے کہا تھا۔''اماں وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔''

اماں نے ایک نہ سنی ۔اپنی کہی کر ڈالی۔

وہ اس سے بھاگنے کی کوشش کرتی تو گناہوں کے بوجھ تلے دب جاتی ۔اماں کی نصیحتیں کانوں میں گونجنے لگتی۔

''وہ عورت جہنمی ہوتی ہے جو اپنے میاں کو خوش نہ کر سکے۔''

وہ خود کو مجازی خدا کی خواہش پر قربان کر دیتی ۔مگر دل زندہ ہی نہ ہوتا......مُردہ ہی رہتا ۔ بہت کوشش کرتی دل اور زندگی ایک ساتھ ہو جائیں......مگر جیسے ہی فواد گھر میں داخل ہوتا......اس کا دل چاہتا کہیں چھپ جائے......وہ کہیں نظر نہ آئے......پھر وہ فواد کے چھوٹے چھوٹے کام کرتی...... بڑی سُست سی چال رہتی ۔ نہ آنکھوں میں خمار ہوتا نہ بدن کے کسی کونے میں کوئی خواہش سر اٹھاتی ، یادیں دھواں بن جاتیں ۔

اس کی روح کے پنجرے کے ساتھ اب کوئی چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔اس نے ناگواری سے آنکھیں موند لیں ۔ دو آنسو آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر بھاگے اور تکیہ میں چھپ گئے ۔

بساند اور عجیب سی بد بو کمرے میں پھیلتی جا رہی تھی ۔نشاط کا رتّی بھر احساس نہ تھا وہ مجبور تھی ۔ پنجرے میں اس کی روح پھڑ پھڑاتی رہی ۔ مالک نے اپنی ملکیت کو خوب جھنجھوڑا...... کہ بس......روح کُرلاتی رہی اس کا درد نقطۂ انجماد کو چُھونے لگا......تو وہ بے حسی سے کروٹ لے کر خرخر کرنے لگا۔اور اس کا وجود اور روح ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے ۔

شانزہ نے روح و جسم کے مالک سے سودا کر رکھا تھا۔زندگی کو گھسیٹنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔وہ کر بھی کیا سکتی تھی ۔

صبح کی سفیدی پھیلتی جا رہی تھی......اس نے روح کے کرب کو ہلکے میک اَپ کی تہہ میں چھپایا، لائٹ پنک کلر کی لپ اسٹک ہونٹوں پر اچھی طرح جمائی ۔مسکراہٹ کو جاندار بنانے کی کوشش کی ۔ آئینے میں دیکھا چہرے کے Expressions پر کوئی داغ تو نمایاں نہیں ۔ پرفیوم کے اسپرے سے بساند کا احساس جاتا رہا۔

اب وہ خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی ۔شانزہ نے چائے کا کپ لیا اور اخبار دیکھنے لگی ۔فرنٹ پیج پر ایک خبر نے اسے چونکا دیا۔

’’خاوند نے شک کی بناء پر بیوی کو مار دیا۔اس کا دعویٰ تھا......اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی تھی ۔‘‘

شانزہ کو سامنے دیوار پر آویزاں آئینے میں سب دکھائی دینے لگا۔مگر اس عورت کی جگہ وہ خود تھی ۔فواد اس کے بال کھینچ رہا تھا۔ مار رہا تھا۔

شروع شروع میں تو عورت مرد کی مار کھا لیتی ہے ۔اذیت سہہ لیتی ہے...... جب برداشت کی انتہا ہونے کو ہو تو عورت بھی جاگ جاتی ہے......اندر باہر، سے پھر وہ کیا کرتی ہے ۔احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتا ۔الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں ۔ وہ تو صرف محبت کا درس دہرانا چاہتی ہے......محبت کرنا چاہتی ہے...... جب محبت نہ ملے......دُکھ اور کرب کا سامنا رہے تو پھر پتہ نہیں کہاں سے......کس طرح وجود میں روشنی بھرنے لگتی ہے ۔خوشبو بکھرنے لگتی ہے......کوئی بات، مسکراہٹ دل میں اترنے لگتی ہے ۔

فضا گنگنانے لگتی ہے......روح کے تار تار سے محبت ہے......محبت ہے......کی صدا گونجنے لگتی ہے ۔

وہ سرشار سی اِدھر اُدھر، یہاں وہاں پھرتی ہے ۔ دنیا کے دھندے نبٹاتی ہے ۔ بچے بھی پیدا کرتی ہے ۔ پالتی ہے......رشتے بھی نبھاتی ہے مگر صرف اور صرف اس مہک کے ساتھ چلتی ہوئی زندہ رہتی ہے ۔ جو خواب کا در کھلتے ہی روئی جیسے نرم بادلوں کی اوٹ سے آتی ہے ۔ دھند میں لپٹا ہیولہ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے ۔محبت کے لمس سے سارا وجود جاگ جاتا ہے ۔خوشبو یہاں وہاں بکھرنے لگتی ہے ۔حوا کی بیٹی محبت پا کر مسکرانے لگتی ہے ۔

مگر جب اس کے دل پر پاؤں رکھ کر کوئی کچل ڈالے......دل کو مٹی میں ملا دے ٹکڑے ٹکڑے کر دے......

پھر عورت زخمی ناگن بن کر ایسا زہریلا وار کرتی ہے...... کہ سب کچھ خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے ۔ روایات کی بھینٹ چڑھنے والی عورت ہر بھرم کو توڑ کر خود ہلکان ہو جاتی ہے ۔ پھر اس کے لبوں پر ایک ہی شکوہ ہوتا ہے ۔

’’کاش میرے دل پر میرا زور چلتا یا پھر......میری مرضی کا خیال رکھا جاتا......
پھر یہ سب نہ ہوتا۔کوئی میرے جسم کو کاٹ کر بدلہ نہ لیتا۔اَنا کی جنگ یوں نہ لڑی جاتی۔‘‘
جیسے ہی بدن مردہ ہوتا ہے روح قہقہے لگانے لگتی ہے۔آسمان کی وسعتوں میں گم ہو کر وہ ہاتھ تھام لیتی ہے۔ جسے تھامنے کی خواہش نے تھکا ڈالا۔
شانزہ کو فواد کے ہاتھ پر اپنے خون کے چھینٹے دکھائی دیئے تو اس نے بھی پرواز کرنے اور نیلے فلک پر اُڑتے رَتھ میں بیٹھنے میں دیر نہ کی۔

❍......❖......❍

قصوروار

میں حیدرعلی ہوں ۔پچھلے ماہ میرے ابا نے میری اماں کو طلاق دے دی ۔ میری ایک دادی اور دو پھوپھیوں کی میری اماں نے بہت خدمت کی ۔ دن رات ایک کر دیا۔اس خدمت کا اجر اماں کو یہ ملا کہ انہوں نے ابا سے طلاق دلوا کر ہی چھوڑی ۔ میں آٹھ سال کا ہوں ۔ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ،میری اماں اتنی سسرال کی خدمت میں جُتی رہی کہ شاید اسے خیال ہی نہ آیا کہ اب میرا کوئی بہن بھائی ہونا چاہئے ۔ابا،اماں سے اتنے لاپروا تھے کہ جیسے ان کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔میری دونوں پھوپھیاں ایک فیکٹری میں کام کرتی ہیں ۔شادی کی عمر نکل گئی ہے ۔اب ان کی زندگی اورنوکری لازم وملزوم ہیں ۔ ہمارے گھر میں گاؤں سے آنے والے مہمانوں کی وجہ سے میلہ لگا رہتا ہے ۔میری اماں کو صبح سے شام تک کچن سے فرصت نہیں ۔ وہ سارا دن کچن میں گھسی رہتی تھی ۔ میں نے کبھی اپنی اماں کو نہا کر گیلے بالوں کو سکھاتے نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر سنورتے دیکھا اور تو اور اماں کے پاس اتنا بھی وقت نہ تھا کہ میری پیشانی ہی کبھی چوم لیتی ۔رات کو میرا دل چاہتا کہ اماں میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرے مگر اماں تھک کر چارپائی پر ایسے گرتی کہ پھر کوئی ہوش نہ رہتا۔میرا دل چاہتا میں اپنی اماں کے بازو دباؤں ، پیر دباؤں مگر میری دادی بڑی غصہ والی تھی ۔ وہ مجھے اماں کے پاس جانے ہی نہ دیتی ۔ میں رات کو چاند کی روشنی میں اماں کے چہرے کو تکتا تکتا جانے کب سو جاتا۔سوتے میں میری اماں بالکل پری جیسی لگتی تھی ۔

میں باہر گلی میں کھیل رہا تھا،میری دونوں پھوپھیاں فیکٹری سے آچکی تھیں ۔ پتہ نہیں کیا ہوا پھر کہ گھر سے میری دادی اور میری پھوپھیوں کی چیخنے کی آوازیں آنے لگی ۔ جب میں گھر گیا ابا اور اماں صحن میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے ۔ دادی چیخ رہی تھی کہ تم دونوں کو شرم نہیں آتی ۔کنواری لڑکیوں والا گھر ہے ۔ کچھ تو حیا کرو، ابا منمنائی آواز میں بولا ۔اماں میں نے ہاتھ ہی تو پکڑا تھا مگر ابا کی آواز پھوپھیوں کی چیخ وپکار میں دب گئی ۔اس رات ابا گھر نہ آیا۔اور میں نے اماں کو روتے ہوئے دیکھا۔

میرے اندر اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ میں اٹھ کر اپنی ماں کے آنسو ہی پونچھ ڈالتا۔ میں بزدل ، ڈرپوک نام کا ہی حیدر تھا۔ پھر میرا ابا جو لکڑی کی چیزیں بنانے کا ماہر سمجھا جاتا تھا دادی کے سامنے مجبور ہوگیا۔اور اس نے اماں کو طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کیا۔

میری اماں نے جس دہلیز پر دلہن بن کر قدم رکھا تھا۔طلاق کی سند لے کر پار کرنی پڑی ۔زمین نے میرے پیر پکڑ لئے تھے ۔ میں اپنی اماں کو اپنے اور ابا کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔اماں روتی ہوئی باہر نکلی تو ابا چارپائی پر گر سا گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ کھڑا تھا ۔ جب ہوش میں آیا تو گلی کی طرف بھاگا ۔ ہمسائی نے بتایا اب کیا فائدہ!''تیری ماں تو چلی گئی ۔'' تُو بھی باپ کی طرح بزدل ہے ۔کیا خاوند کو حق نہیں کہ اپنی بیوی سے بات کرے ۔اس کا ہاتھ ہی پکڑا تھا نا ، بیوی تھی اس کی نامحرم نہ تھی ۔ جو تیری دادی اور پھوپھیوں نے واویلا مچادیا۔''

میرا معصوم ذہن اس بات کا ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ ابا نے صحیح کیا یا غلط مجھے تو صرف یہ دکھ ہے کہ میری اماں روتی ہوئی کہاں گئی ہے۔ کیا رات تک واپس آ جائے گی۔ جیسے میں کبھی کبھی روتا ہوا گھر سے دادی کی ڈانٹ سن کر نکل جاتا تھا اور پھر اندھیرے سے خوف کھاتے ہوئے جلد ہی لوٹ آتا تھا مگر اماں کو گئے تو اب پانچ راتیں ہو گئی ہیں، وہ لوٹ کر نہیں آئی۔ اب پتہ چلا ہے کہ میری اماں مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ دادی اپنے پاس۔ مگر میرا دل کیا چاہتا ہے؟ کوئی نہیں پوچھتا۔

سنا ہے کہ اماں کے بھائیوں نے مقدمہ کر دیا ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے۔ اب میں سوچتا ہوں کیا واقعی اماں کو مجھ سے اتنا پیار ہے۔ کہ وہ میرے بغیر نہیں رہنا چاہتی۔ ادھر دادی کی محبت بھی عروج پر ہے۔ ہر وقت مجھے اپنے ساتھ چمٹائے رکھتی ہے۔ مگر دادی کی ایک بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ جب وہ دوسروں کے سامنے کہتی ہے کہ ''میری اماں آوارہ تھی۔'' بھلا آوارہ عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جو صبح سے شام تلک کچن میں گھسی رہتی ہیں اور سسرال کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہیں اور بنتی سنورتی بھی نہیں۔

سنا ہے کہ عدالت میں مجھے بھی جانا ہوگا اور وہاں جا کر مجھے بتانا ہوگا کہ میں کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں صبح سے رات تک یہی سوچتا ہوں کہ میں کیا کہوں گا مگر دادی مجھے مجبور کرتی ہے کہ تم وہاں جا کر یہ کہنا کہ میری اماں اچھی نہیں، میں اپنی دادی اور ابا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میرا سانس رکنے لگتا ہے۔ دادی کی باتیں سن کر۔ ابا تو اب خاموش سا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی ابا کہتا ہے کہ بڑا بھائی کسی جوگا نہیں رہتا۔ کاش مجھے اللہ نے بڑا بیٹا نہ بنایا ہوتا۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ ابا بھی دُکھی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی۔ میری دادی کو کیا ملا میرے ابا اور اماں کو الگ کر کے کیا ہم اکٹھے مل کر نہیں رہ سکتے تھے۔

کبھی کبھی دادی اور پھوپھیوں کو ہنستے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا میری اماں بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر قہقہے لگا کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ شاید نہیں کیونکہ میری اماں دادی کی بیٹی نہیں بہو تھی۔ میں سوچتا ہوں کیا میں اماں کے حق میں فیصلہ کر دوں، پھر سوچتا ہوں ابا کے بغیر بھی تو مزہ نہیں آئے گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم پھر سے مل کر رہنے لگیں مگر ابا کہتے ہیں کہ طلاق کے بعد رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیا اب میں ساری زندگی کٹی پتنگ کی طرح کبھی اماں کی طرف اور کبھی ابا کی طرف جاتا آتا رہوں گا؟ میرا گھر کون سا ہوگا؟ ویسے میں نے سوچ لیا ہے کہ میں عدالت میں جا کر کہوں گا کہ میں دونوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میری اماں اور ابا کو الگ کرنے میں سارا قصور میری دادی کا ہے، سزا تو پھر دادی کو ہی ملنی چاہیے۔

بختاور

منیر احمد کے گھر 20 جنوری کوایک بچی نے جنم لیا۔ یہ پہلی اولاد تھی۔ پہلی خوشی تھی جو دونوں میاں بیوی نے خوشی خوشی جھولی میں لے کر سجدہ شکرادا کیا۔ اماں کہتی تھیں کہ اس دن تیرے ابا کو پر لگ گئے تھے، اُڑتا پھرتا تھا۔ بی بی جی نے ناک منہ چڑھا کر کہا بھی کہ منیرے بیٹی ذات کی خوشی نہیں مناتے مگر ابا نے اپنی ماں کی بات مذاق میں اڑا دی۔ ویسے بھی جب اپنی اولاد کی محبت کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے پھر اپنے ماں باپ بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ابا نے میرا نام بختاور رکھا۔ شاید ابا بھی ڈر گیا تھا کہ ماں باپ بیٹیوں کے نصیبوں سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے ابا نے میرا نام بختاور رکھ دیا کہ شاید یہ بار بار بختاور پکارنے سے سچ مچ بختاور بن جاؤں مگر آنے والے وقت نے آہستہ آہستہ ثابت بھی کر دیا کہ میں بختاور ہی ہوں۔

مجھے پڑھنے لکھنے میں بڑی دلچسپی تھی۔ میں ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھی۔ ابا میرا علم کا شوق دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔ میں نے خوب محنت کی اور قسمت بھی خوب چمکی۔ میں ہر کلاس میں فرسٹ آتی، سکول سے کالج پھر یونیورسٹی کا بھی خواب پورا کیا۔ اگر چہ چچا، تایا، ماموں سب نے بڑی مخالفت کی کہ لڑکی ذات ہے۔ خراب ہو جائے گی اتنا نہ پڑھاؤ مگر ابا نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ خاندان بھر میں ذہانت کا چرچا تھا۔ میں ایک سکول میں نوکری کرتی تھی۔ اچھا پہنتی اور کھاتی تھی۔ زندگی بڑے ہی مزے سے گزر رہی تھی جب اچانک ہی ابا کو میری شادی کی فکر ہوئی۔ دو تین سال کی خوب محنت سے ایک اچھا رشتہ مل گیا۔ میں ایک اچھی زندگی کا سپنا آنکھوں میں سجائے علی رضا کے گھر آ گئی۔ ابا کو میرے بختاور ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ وہ میری طرف سے مطمئن تھے مگر میں جس گھر گئی تھی وہ مجھے اپنا سمجھ نہیں رہے تھے۔ بات بات پر میری تذلیل ہوتی۔ مجھے گھریلو سیاستوں کا علم نہ تھا۔ سو بیوقوف سی بنی سب سنتی رہتی۔ ویسے بھی ابا نے کہا تھا کہ انسان خود اچھا ہو تو سب اچھے ہو جاتے ہیں۔ میں نے یہی بات ذہن میں بٹھالی۔

اگلے گھر بیٹیوں کی ڈولی جاتی ہے تو پھر جنازہ ہی نکلتا ہوتا ہے۔ مگر مجھ بختاور کی بدقسمتی کا یہیں سے آغاز ہو گیا۔ میں ابا کے گھر کیا آئی۔ شادی شدہ زندگی کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہر طرف سے طعنہ زنی ہونے لگی۔ بڑی چچی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یونیورسٹی سے ہی لڑکوں کو پیچھے لگایا ہوا تھا۔ ساس کو خبر ہوئی تو نکال باہر کیا۔ ورنہ کون بہو کو، وہ بھی نئی نویلی دلہن کو باہر نکال دیتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ میرے کانوں میں ہر طرف سے ایک ہی صدا آتی۔ بیٹی کو اتنا پڑھانا ہی نہیں چاہئے۔ یہ پڑھ لکھ کر شُترِ بے مہار ہو جاتی ہیں۔ بدزبان بھی اور آزاد خیال بھی۔ میرے اوپر جو الزام لگے مجھے نہیں پتہ وہ کس حد تک درست تھے کیونکہ میں کم گو اور تنہائی پسند تھی۔ لباس میں سادگی، بول چال میں متانت تھی۔ جبکہ میرے سب چچا اور ماموں کی بیٹیاں تیز طرار اور خوب فیشن زدہ تھیں۔

میں خاموشی سے سب کی سنتی اور سوچتی، ابا تیری بختاور اب بختاور نہیں رہی۔ بدقسمت ہو گئی ہے مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ سب

کی کڑوی کسیلی سن کر بھی ہمت سے کام لیا، کیونکہ میری تعلیم نے مجھے باہمت ہی تو بنایا تھا۔ اب میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ تعلیم کو جاہلیت کے سامنے ہارنے نہیں دوں گی، خواہ کتنی ہی محرومیوں کا سامنا کرنا پڑے۔ میں نے علی سے کہا آپس کی ناچاقیوں سے گھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ گھر کو ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔ مگر جوڑنے کی بات کوئی نہیں کرتا۔ باہمی گفتگو سے بھی مسئلے حل ہو سکتے ہیں مجھے میرا قصور بتایا جائے میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ اس نے کہا۔

''میرے گھر والے کہتے ہیں اتنی پڑھی لکھی لڑکی لانی ہی نہیں چاہیئے۔ پڑھی لکھی لڑکیاں تو ہٹ دھرم ہوتی ہیں۔''

میری ساس اور نندیں جب گلا پھاڑ کر ہنستی، قہقہے لگاتیں تو میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کرتی کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسلامیات کی ٹیچر کہتی تھی۔

''میری بیٹیو! جاہلوں کی طرح اونچی آواز میں ہنسی مذاق نہ کیا کرو۔ عورت کی آواز دھیمی ہونی چاہیئے۔''

میں فلمیں اور ڈرامے نہ دیکھتی تھی، نہ تبصرے کرتی تھی۔ یہ بات بھی مجھے پاگل قرار دینے کو کافی تھی۔ پھر طلاق تک نوبت پہنچی تو علی نے کہا میں بختاور کو طلاق نہیں دوں گا۔ سُسر صاحب جو کسی ہٹلر سے کم نہ تھے نے خالی ہاتھ بیٹے کو نکال باہر کیا۔ میں سب کچھ بھول کر علی کے ساتھ ایک چھوٹا سا آشیانہ بنا کر بیٹھ گئی۔ اس دوران اللہ نے مجھے ایک بیٹا دے دیا، میں بھی نوکری کرتی علی بھی اور ہمارا بیٹا ابا کے پاس ہوتا۔ ہم نے بڑی مشکل سے کھڑے ہونے کی جگہ بنائی مگر میں دیکھتی تھی کہ لوگوں کی نظروں میں ہماری کوئی عزت نہ تھی۔ کوئی کہتا اس کو ساس کے ساتھ گزارا نہیں کرنا آیا۔ ایک دن تو دادی نے بھی کہہ دیا کہ تم نے پڑھ لکھ کر کیا تیر مار لیا، ساس کے ساتھ چند دن بھی نہ گزار سکی۔ اب میں کس کس کو اپنی صفائی پیش کرتی۔

میں نے چپ سادھ لی مگر اندر ہی اندر کڑھتی کہ ابا کی یہ بات غلط ہے کہ خود اچھے ہو تو سب اچھے ہیں۔ میں نے تو ہر ایک کے ساتھ اچھا ہی کیا۔ پھر میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟

علی بہت محنتی تھے۔ دن رات محنت کر کے روزمرہ ضرورت کی چیزیں ہم نے آہستہ آہستہ خریدیں اور زندگی کو سہل بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہم دونوں نے شادی کے بعد ایسی مشکلیں اٹھائیں کہ ہم وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ مگر کوشش کرتے رہے کہ ہم نے خود کو منوانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابا، اماں اکثر کچھ نہ کچھ لے کر آتے مگر میں انہیں کہتی ابا مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دیں۔ علی کو بہت اچھی نوکری مل گئی۔ اب لگتا تھا کہ اچھے دنوں کے خواب پورے ہوں گے۔

ان دو تین سالوں میں میرے چچا، ماموں کی بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں اور ایک دو تو طلاق لے کر گھر بیٹھ گئیں۔ ان کے گھر کے مسائل کی الگ ہی داستان ہے۔

ایسے موقعوں پر میری مثال دی جانے لگی کہ بختاور کو دیکھو کتنی جنگ کی اس نے شادی کے بعد ایک بھی خوشی نہیں دیکھی مگر دیکھو اُف تک نہیں کی اور تعلیم کے بل بوتے پر اپنے پاؤں پر کھڑی ہے۔ اپنے بچوں کی بھی اتنی اچھی تربیت کر رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں ایک سلگتی زندگی گزار رہی تھی مگر کبھی کسی نے اتنا نہ کہا کہ کیسے اتنی مشکل زندگی گزار رہی ہو؟ کیسے بسر ہو رہے ہیں دن رات؟

ہاں جب ایسے جملے سنتی کہ بختاور نے اچھا کیا۔ نوکری کر کے اپنا گھر بنا لیا۔ اُجڑے آشیانے کو بسانے کی ہمت تو کی۔ میرا سیروں خون بڑھ جاتا۔ میں سجدہ شکر بجا لاتی۔ یا اللہ تیرا شکر تو نے میری محنت، میرے علم کی لاج رکھی۔ آج دس سال بعد میں اپنی ایک شاگرد کو اپنی کہانی سنا رہی ہوں۔ جو نئی نئی شادی کے بعد اوپر تلے کی پریشانیوں سے گھبرا کر میرے پاس آئی تھی۔ میری کہانی سن کر اس کے اندر شکست نے دم توڑ دیا۔ حوصلے نے امید پکڑ لی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ جاننے والا اور نہ جاننے والا (عالم اور جاہل) کبھی برابر نہیں

ہو سکتے۔ان جاہلوں کے ساتھ رہ کر بھی قائل کیا جا سکتا ہے کہ صبر و برداشت کا دامن تھام کر ہی اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ جو بُرا بھلا کہہ رہے ہوتے ہیں۔ وہی آپ کی عظمت کو مانتے ہیں۔ رشتہ توڑنے والے ہزار ہوتے ہیں جوڑنے کی کوئی کوئی بات کرتا ہے ۔رشتے مٹی کے نہیں بنے ہوتے جب چاہو توڑ لو۔ جب چاہو جوڑ لو۔اللہ کے بنائے رشتے جوڑتے رہو۔اللہ کی مدد بھی شاملِ حال ہو جاتی ہے اور ایک دن وہ وقت آ جاتا ہے جب آپ کے سامنے معافی کے طلب گار کھڑے ہوتے ہیں اور یہ آپ کی مرضی ہوتی ہے کہ معاف کر دو یا سزا سنا دو۔ جو علم کی روشنی سے سیراب ہوتے ہیں وہ آگے بڑھ کے ہاتھ تھام لیتے ہیں۔محبت کے رشتے چاہت کی چاشنی سے مضبوط تر کرتے چلے جاتے ہیں۔سکول میں چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔میرے بچے سکول سے واپس آ گئے تھے۔

میری سٹوڈنٹ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے ٹوٹتے گھر کو بچانے چل دی۔اپنے بچوں کو کھانا دیتے وقت میں سوچ رہی تھی کہ گزرے وقت کی تلخیاں بیان کرنا بھی اذیت سے خالی نہیں ہوتا۔ہم آسانی بانٹنے کی بات نہیں کرتے۔صرف دل شکنی کی بات کرتے ہیں۔اپنی کہانی سنانے سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں بُرے دنوں کی پرچھائی ہمارے اچھے دنوں پر کوئی داغ نہ ڈال دے۔حالانکہ عزت اور ذلت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

فیصلہ

میرے اخلاق اورخوبصورتی کی ہرکوئی تعریف کرتا۔ میں کہیں بھی جاتا دلوں کوموہ لیتا۔ دوسروں کا خیال تھا کہ میں خوش گفتار ہوں ۔مسکرا کر بات کرنے کا ہنر جانتا ہوں۔شریف طبع ہوں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا۔ ماں جی تو میرے ماتھے پر سہرا سجانے کا خوب آنکھوں میں لئے ہی ابدی نیند سوگئیں۔اب ابا جان کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ آپ جہاں مناسب سمجھیں کر دیں۔تاخیر کی وجہ خدانخواستہ ایسی نہ تھی کہ میں نے محبت میں چوٹ کھائی تھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔اماں کے ہوتے ہوئے بھی جہاں کہیں رشتے کی بات ٹھہرتی خاموشی سی ہو جاتی کبھی کبھی میں سوچتا آخراس کی کیا وجہ ہے؟

دوست احباب بھی کہتے ''یار تم جیسے لڑکے تو رشتے دار فوراً اپنی بیٹیوں کے لئے اُچک لیتے ہیں۔لگتا ہے تمہارے رشتے داروں کی قریبی نظر کمزور ہے۔''

میں ایسی باتیں ہنسی میں اڑا دیتا۔مگر اب مجھے بھی اس بات کی فکر ہو رہی تھی۔ میں 35 برس کا ہو چکا تھا اور ابا جان کی بھی طبیعت ٹھیک نہ رہتی تھی۔اگر چہ گھر کے کاموں کے لئے ہم نے ایک خادمہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ ماں بیٹی گھر کا سارا کام کر جاتی تھیں۔ بڑی ایمانداری سے وہ میرے اور ابا جان کی غیر موجودگی میں صبح 10 بجے سے شام 4 بجے تک گھر کا سارا کام نبٹاتی تھیں۔ میں بہت چھوٹا سا تھا جب سے خالہ صغریٰ گھر کا کام کرتی تھیں۔ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔

اماں کے مرنے کے بعد ابا جان نے خالہ صغری سے کہا:''بہن یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے جیسے پہلے کام کرتی تھی اب بھی ویسے ہی کرنا۔اب اس گھر کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔میری بہو آ جائے پھر جیسے تمہاری مرضی۔''

خالہ صغری نے کہا۔''بھائی صاحب آپ فکر نہ کریں میں پوری ایمانداری سے اپنا فرض نبھاؤں گی۔''

میری طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔ پہلے تو باجی میرے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنے میں لگی رہتی تھیں۔ جتنا مجھ سے ہو جاتا میں کر لیتی۔ باجی کہتی تھیں۔

''صغریٰ جتنا آسانی سے کام ہو جائے کرلو باقی کل سہی۔تھوڑا بہت میں شام کو کر دوں گی۔اللہ بخشے بھائی صاحب! باجی بہت ہی نیک تھیں۔ہم جیسوں سے بھی برابری کا سلوک روا رکھتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاتی پلاتی تھیں۔کبھی کسی چیز کا دُکھ نہ آنے دیا۔ اس گھر سے میں کبھی خالی ہاتھ نہ گئی تھی۔شام کو کھانا دے کر رخصت کرتی۔ میری بیٹی رابعہ ان کی مہربانی سے ہی ایف اے کر گئی، ورنہ میں غریب کہاں اسے پڑھا سکتی تھی۔خالہ صغریٰ آج اماں جی کو یاد کر کے رو رہی تھی۔میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ابا جان بھی سر جھکا کر بیٹھ گئے۔وہ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

پھر ابا جان بولے۔''اس گھر کے سارے کام نبٹا کر جاتے وقت اپنے لئے کھانا،فریج سے پھل اور دودھ لے جایا کرنا۔تمہیں پتہ

ہی ہے ہم دونوں کتنا کھاتے ہیں۔ پھل اور دودھ تو روز ہی آتا ہے۔ اس لئے یاد سے بچی کے لئے جو دل چاہے لے جایا کرنا اور رابعہ بیٹی کو آگے بھی پڑھانا۔ میں اس کا خرچہ دے دیا کروں گا۔ ہمارے یہاں کون سا رشتے دار رہتے ہیں۔ سب دور دراز ہیں۔ اس لئے کم ہی آنا جانا ہوتا ہے۔''

خیر خالہ صغریٰ نے جو کہا نبھایا بھی۔ اماں کو گزرے اب دو سال ہونے کو تھے مگر خالہ نے کبھی بھی ہمیں شکایت کا موقع نہ دیا۔ کپڑے دھلے دھلائے، کھانا پکا پکایا ملتا، گھر صاف ستھرا، کچن سلیقے سے چل رہا تھا۔ ہم باپ بیٹا جب آتے خالہ سارا کام نبٹا کر صحن میں عصر کی نماز پڑھ رہی ہوتی۔ نماز پڑھ کر کھانا لے کر چلی جاتی یہ روز کا معمول تھا۔ میں بڑا حیران ہوتا بھرا گھر ہے خالہ کا ایمان کبھی خراب نہ ہوتا۔ میرے دفتر کا چپڑاسی اکثر ہی کسی نہ کسی کو کچھ لا کر دیتا اور پانچ دس کی ڈنڈی مار جاتا۔

ایک دن خالہ صغریٰ کو بھی ابا جان نے میرے رشتے کے لئے کہا۔ خالہ نے بہت جلد اس پر عمل بھی کیا اور شام کو ہی ایک رشتہ کروانے والی کو لے آئی۔ اس نے ہزار کا نوٹ لیا اور دو تین دن کا کہہ کر چلی گئی۔

آج اتوار تھا میں ذرا دیر تک سوتا تھا۔ میں ابھی بستر پر ہی تھا جب مجھے خالہ کے آنے اور سلام کرنے کی آواز آئی۔ ابا جان صحن میں ہی اخبار پڑھ رہے تھے۔ خالہ پاس ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

خالہ آہستہ سے بولیں۔ ''بھائی صاحب! آپ سے ایک بات پوچھوں اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ وہ شرجیل بیٹا...... میرا مطلب ہے کہ یہ میں نہیں وہ رشتہ کروانے والی کہہ رہی تھی کہ صبح صبح پوچھ کر بتاؤ کہ شرجیل بیٹا آپ کی اپنی اولاد ہی ہے؟''

خالہ صغریٰ بڑی کوشش کر رہی تھیں کہ آہستگی سے بات کرے مگر پھر بھی ان کی آواز میرے کانوں میں پڑ ہی گئی۔ جب انہوں نے اتنی راز داری سے میرا نام لیا میں اور بھی چوکنا ہو گیا اور سننے لگا۔ ابا جان نے بڑی سنجیدگی سے خالہ کی بات سنی۔

اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہن اس میں کوئی شک نہیں کہ شرجیل ہماری اپنی اولاد نہیں ہے مگر ہم نے اُسے بچوں سے بڑھ کر پالا ہے۔ اس کی ماں اسے جنم دے کر مر گئی، وہ بے چاری ایک دُکھی عورت تھی۔ شادی ہوئی تو ماں باپ ایک حادثہ میں مر گئے۔ غربت کی وجہ سے جہیز نہ لے جا سکی۔ اس کے طعنے بھی سننے کو ملتے تھے۔ خاوند ایک دن صبح کام پر گیا مگر واپس نہ آیا۔ اُسے سڑک پر ایک کار کچل گئی۔

سسرال والوں نے بے چاری کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ رشتے میں میری نانی اماں کی بھانجی تھی۔ اس کو ہمارے گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ سو ہم اُسے لے آئے اور تیری بیگم صاحبہ نے بڑی خدمت کی۔ جاتے جاتے وہ صلے میں ہماری جھولی میں شرجیل کو ڈال گئی۔ ہم تو پہلے ہی اولاد کو ترسے ہوئے تھے۔

شادی کے 19 سال بعد بھی ہمارے اولاد نہ ہوئی۔ ہم شرجیل کو لے کر لاہور آ گئے تا کہ ہمارے بیٹے کو کبھی علم نہ ہو کہ ہم صرف اس کو پالنے والے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ابا جان رو پڑے۔

خالہ بولیں۔ ''اب مجھے سمجھ آئی کیوں شرجیل بیٹے کی بات نہ ٹھہرتی تھی۔ اصل میں بھائی صاحب! لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ نے شرجیل کو ایدھی ہوم سے لیا ہے۔ اور یہ بات وہ کراچی والے مرزا صاحب کے گھر سے نکلی ہے۔ جن کی چھوٹی بیٹی کے ساتھ شرجیل بیٹے کے رشتے کی بات چلی تھی۔''

''ہاں بہن! وہ بڑی والی کا رشتہ دے رہے تھے ہم نے کہا اس کا اور ہمارے شرجیل کا جوڑ نہیں بنتا۔ آپ چھوٹی کا دے دیں کیونکہ وہ پڑھی لکھی بچی تھی۔'' ابا جان نے وضاحت کی۔

''بڑی تو ابھی بیٹھی ہے۔ مڈل پاس ہے اس کا اور ہمارے شرجیل کا کیا جوڑ۔ خیر بھائی صاحب! ہر ایک کے دماغ میں ابھی تک یہی بات ہے اور ظاہری بات ہے جس نے بیٹی دینی ہوتی ہے وہ تھوڑی بہت جانچ پڑتال تو کرتا ہی ہے۔ اور بیٹی والے محلے میں آ کر اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو آگے یہ بات معلوم ہوتی تو خاموش ہو جاتے۔ اب آپ فکر نہ کریں یہ کام اب آپ میرے سپرد کر دیں اس محلے کے بہت سارے گھر شرجیل بیٹے کو رشتہ دینے کو تیار ہیں مگر اس غلط فہمی کی وجہ سے بات آگے نہ بڑھاتے تھے۔ اب ان کی یہ غلط فہمی میں دور کروں گی۔'' خالہ صغریٰ نے ابا جان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

اندر بستر پر لیٹا میں زار و قطار رو رہا تھا کہ میں اتنے سال اندھیرے میں رہا۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ جن کے ساتھ سارے موسم بتائے وہ میرے نہیں اور جو میرے اپنے تھے وہ کب کے مجھے چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کب ابا جان اندر آ گئے اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ گلے سے لگا کر بولے۔

''بیٹا اگر اس میں ہم قصوروار ہیں تو جو چاہے سزا دو۔ ہمیں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہئے تھا۔ ہم تو سمجھتے کہ ہم تیری اچھی تربیت کر کے شاندار مستقبل دیں گے۔ تمہیں ایک کامیاب انسان بنائیں گے۔ تُو شاید اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دے گا اگر ہو سکے تو مجھے اور اپنی ماں کو معاف کر دینا۔''

ابا جان کی باتوں سے میری آنکھیں کھل گئیں کہ اگر یہ نہ پالتے تو میں نہ جانے کون سے یتیم خانے میں پل کر سڑکوں پر دھکے کھا رہا ہوتا۔ آج اگر ایک کامیاب فرد ہوں تو صرف ان کی اچھی تربیت کی وجہ سے ہوں پھر میں یہ کیا کر رہا ہوں؟

میں نے رو کر کتنی چھوٹی سوچ کا ثبوت دیا۔ اپنے ابا جان کو رُلایا جنہوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ جنہوں نے لفظوں کی پہچان سکھائی۔ زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ میں نے رو کر احسان فراموشی کا ثبوت دیا تھا۔ میں فوراً اٹھا ابا جان کے گلے لگ گیا اور ان کے ہاتھ چومنے لگا۔ اب مجھے کوئی پروا نہیں کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

میں نے آج ابا جان سے کہہ دیا کہ آپ میری شادی خالہ صغریٰ کی بیٹی سے کر دیں۔ آخر کو B.A پاس ہے۔ گھر داری بھی جانتی ہے۔ خالہ بھی اچھے رشتے کے انتظار میں ہے۔ خالہ اتنی ایماندار ہے اس نے اپنی بیٹی کی تربیت بھی اچھی کی ہے۔

''مجھے خوب صورت نہیں نیک سیرت بیوی کی ضرورت ہے۔''

ابا جان کو اپنا یہ فیصلہ سنا کر میں بہت مطمئن ہو گیا۔

❍......❖......❍

مٹی کے رنگ

تیمور علی بی اے پاس کر چکا تھا۔اب نوکری کی تلاش میں تھا۔باپ کمہار تھا۔علی اکبر نے بڑی کوشش کی تیمور علی نوکری کی خواہش چھوڑ کر آباؤ اجداد کا پیشہ اختیار کر لے مگر جوانی کا گرم خون جب اس کے اندر اُبل کر اسے اَنا اور خودداری کا سبق پڑھاتا تو وہ کہتا''ابا اب اتنا پڑھ لکھ کر مٹی میں ہی ہاتھ ڈالوں۔یہی کام کروانا تھا تو سکول نہیں بھیجنا تھا۔'' پر بیٹا پڑھائی یہ تھوڑی کہتی ہے کہ پڑھ لکھ کر آبائی پیشہ اختیار نہ کرو۔علی اکبر مٹی میں ہاتھ ڈالے بڑے پریم سے مٹی کو تھپتھپاتا جیسے اپنے بچے کو شاباش دی جاتی ہے۔

تیمور علی کی زندگی اسے جانے کیا سمجھانا چاہتی تھی۔یہ وہ تو نہیں جانتا تھا مگر وہ پھول اور خوشبو جانتے تھے جنہیں تیمور ایک گھنٹہ سے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔آج کل وہ ناامید ہو گیا تھا۔صبح جلدی آنکھ کھل گئی تو کھیتوں کی طرف آ نکلا۔سبزے کی خوشبو اور پاس ہی کھلے پھولوں کی خوشبو نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔وہ وہیں بیٹھ گیا۔اور سوچنے لگا یہ پھول اور سبزہ آخر کون سا خود اُگے،قدرت نے جہاں مناسب سمجھا انہیں اُگا دیا۔مجھے جہاں جانا ہوگا میرے لئے بھی قدرت رستے بنائے گی،پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دُعا مانگی یا اللہ میرے لئے بھی ایسے ہی رستہ بنا دے جیسے خوشبو اپنا رستہ بنا لیتی ہے۔مجھے جو کرنا چاہئے میں خود بخود اس کی طرف چل پڑوں۔تیمور علی آنکھیں بند کئے دُعا مانگ رہا تھا کہ اسے قہقہوں اور چوڑیوں کی جلترنگ سنائی دی۔آنکھیں کھولیں تو دو شرارتی آنکھیں ہنستی ہوئی اسے گھور رہی تھیں لڑکیوں نے اُسے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتی یہ جا وہ جا۔

شاید وقت رک گیا تھا۔یا نہیں مگر تیمور علی کی دھڑکن رک سی گئی۔ بس دو آنکھیں ہی اسے یاد رہ گئیں وہ کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے لگا کہ جیسے وہ آنکھیں اس کی روح کھینچ کر لے گئی ہیں۔وہ گھر کی جانب مرے ہوئے قدموں سے چل پڑا۔وہ خود کو گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔اس نے گھر جا کر چائے کے ساتھ اچار پراٹھا کھایا۔جو اس کا پسندیدہ ناشتہ تھا۔مگر اسے چائے اور پراٹھا بدمزہ سے لگے۔اچار کی کھٹاس بھی محسوس نہ ہوئی تو بد دلی سے اٹھا اور جا کر کمرے میں لیٹ گیا۔جیسے ہی آنکھیں بند،کیں دو آنکھیں اس کی آنکھوں میں اُتر آئیں۔اس نے آنکھیں کھول دیں،ایسا بار بار ہوا۔وہ جب بھی آنکھیں بند کرتا شرارتی ہنستی ہوئی آنکھیں اسے پیار سے دیکھنے لگتی۔ پھر اسے یہ تصور اچھا لگنے لگا۔وہ سو گیا خواب میں وہ بڑی دور دور تک گیا۔جب اٹھا تو دوپہر ہو گئی تھی اور تیز دھوپ نکل چکی تھی۔ابا کا چاک گھوم رہا تھا۔اس کی آواز اسے احساس دلا گئی کہ ابا کام کرتا رہا اور وہ سوتا رہا۔وہ اٹھا منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔تو منہ صاف کرتے ہوئے پھر دو شرارتی آنکھیں اسے تنگ کرنے آ گئیں۔اس نے تولیہ تار پر ڈالا اور خود کو سرزنش کی کہ کن کاموں میں پڑ رہے ہو۔

تیمور علی شاید بھول گیا تھا کہ اس نے خوشبو اور پھول کو دیکھ کر جو دُعا مانگی تھی پھول اور خوشبو اس پر آمین کہہ چکے تھے۔دُعا شرفِ قبولیت پا گئی تھی اب رستہ بننے جا رہا تھا۔تیمور کو اس رستہ پر چلنا تھا۔اس پر چل کر ہی اس نے منزل پر پہنچنا تھا۔تیمور کی بے چینی و بے قراری تیمور کو بتا رہی تھی کہ اسے اُس شرارتی آنکھوں والی سے محبت ہو گئی ہے۔تیمور ماننے کو تیار نہیں۔مگر جب رات کو سونے لگا تو چاند

جوعین اس کے سامنے تھا۔اس میں بھی اسے وہ چہرہ نظر آیا تو تیمور علی تڑپ اٹھا۔اور بے چین ہوگیا کہ اب میں کیا کروں؟ دُعا، پھول اورخوشبو اپنا کام کر چکے تھے۔

اگلی صبح وہ جلدی جلدی اٹھا اور کل والی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔اُسے بیٹھے بیٹھے کئی گھنٹے گزر گئے مگر اس کی طلب کی پیاس نہ بجھی۔ دھوپ اس کے چاروں طرف آہستہ آہستہ تپش بڑھا رہی تھی مگر تیمور علی ٹس سے مس نہ ہوا۔اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں وہ کل سے بے چین اور مضطرب تھا۔اپنی اس کیفیت سے تنگ آ چکا، وہ رونے لگا۔یہ مجھے کیا ہورہا ہے۔اس نے اپنے آنسو پونچھے، قمیص کے دامن سے ناک صاف کی۔اٹھ کر چل پڑا۔اُسے لگا دل کو پتنگے لگ گئے ہیں۔وہ دل کو لے کر اِدھر اُدھر اڑ رہے ہیں۔دل اس کے قابو میں نہ رہا۔ وہ وقت کی قید سے نکلتا جا رہا تھا۔نہ اسے دن کا پتہ چلتا نہ رات کا۔نہ بھوک لگتی نہ پیاس بس دو آنکھیں تھیں جو اس کے چاروں طرف اُگ آئی تھیں وہ ان آنکھوں کا اسیر ہو چکا تھا۔اب وہ جتنا اس قید سے بھاگنے کی کوشش کرتا طلب اور بڑھ جاتی۔پھر ایک دن اللہ کو اس پر رحم آ گیا۔وہ ابا کے پاس کھڑا برتن سیدھے کر کے رکھ رہا تھا کہ ایک آواز آئی۔

''چاچا مجھے ایک پیالہ بنوانا ہے اندر سے سادہ باہر سے شیشے والا ہو۔'' تیمور علی نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہاتھ سے گھڑا چھوٹا، ٹوٹ گیا۔ وہ گم صم سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ابا نے کہا شام کو آ کر لے جانا۔ابا نے گھڑے کے ٹوٹنے پر ڈانٹا تو اس نے سوچا گھڑا ہی تو تھا کون سا دل تھا؟

پھر اس نے ابا سے کہا۔''ابا پیالہ میں بناؤں؟'' ابا بولے تُو کہاں اس آوے کو اپنے قابل سمجھتا ہے۔خیر بنا دیکھ۔'' یہ کہہ کر ابا دوپہر کو آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔تیمور علی نے مٹی ہاتھ میں لے کر چاک پر رکھی اور خاص مہارت سے گھمایا۔اس نے بڑے پیار سے پیالہ کے اندر اپنی انگلیوں سے پریم کی کتھا مٹی کو سنائی۔مٹی نے مٹی کی بات جلدی سمجھ لی اور پیالہ نرم و ملائم مٹی کی خصوصیت کا لبادہ محبت سے اوڑھ کر تیار تھا۔اب تیمور حیران تھا کہ یہ پیالہ واقعی میں نے بنایا ہے۔اور بناتے ہوئے وقت کا اسے احساس ہی نہ ہوا۔اسے یہ بھی نہ پتہ چلا کہ یہ کام اسے پسند نہیں۔پھر یہ میں نے کیسے بنایا۔وہ حیران و پریشان پیالہ ہاتھ میں تھامے تھا۔پھر اس کا ذہن ہزاروں سال پرانے دور میں پہنچ گیا۔کہ سقراط ہاتھ میں پیالہ تھامے ہوئے ہے۔اسے معلوم بھی ہے کہ اس میں زہر ہے جسے پیتے ہی اسے ایک بار ملی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھن جانی تھی لیکن چونکہ اسے اپنے نظریات سے محبت تھی، عشق تھا۔اس محبت نے اس کی آنکھوں پہ ایسی پٹی باندھی کہ اس نے وہ زہر پیالہ پی کر زندگی کھو کر زندگی پالی۔زندگی بھی ایسی زندگی جو اب کبھی بھی فنا نہیں ہونے والی تھی۔یقیناً سقراط کو سب پتہ تھا تبھی تو مسکراتے ہوئے اس نے موت کو گلے لگا لیا۔

یہ پیالہ بھی کہیں وہی پیالہ تو نہیں وہ سوال جواب کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

شام کو علی اکبر نے تیمور کا بنایا ہوا پیالہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔اسے وہ پیالہ اپنے ابا کے ہاتھ کا بنا لگا۔علی اکبر کو آج بھی یہ قلق تھا کہ جو صفائی ابا کے ہاتھ میں تھی میرے ہاتھ میں زندگی بھر کام کرنے سے نہ آسکی تھی۔وہ کہتا تھا۔''پتر علی اکبر دھیان اور گیان کام کے ساتھ ہو تو پھر اللہ عرش سے اُتر کر الٹا کام بھی سیدھا کر دیتا ہے۔کام سے عشق ہونا چاہیئے۔عشق بنا بھی زندگی کوئی زندگی ہے خالی خالی سی۔وہ لڑکی شمائلہ زمیندار چراغ دین کے گھر مہمان آئی تھی۔شہر میں پڑھتی تھی فلسفہ کی طالبہ تھی۔شہر سے گاؤں دیکھنے آئی تھی۔جس دن وہ گاؤں آئی اس دن اس نے سب سے پہلے گاؤں میں تیمور علی کو دیکھا وہ کھویا کھویا سا جا رہا تھا۔اس نے ساتھ بیٹھی چاچا چراغ کی بیٹی سلمٰی سے پوچھا۔''سنا ہے کہ گاؤں میں ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔یہ کون ہے؟'' سلمٰی نے بتایا۔''یہ چچا کمہار کا بیٹا ہے بی اے پاس ہے اور نوکری کرنا چاہتا ہے۔اسے اپنے پُرکھوں کا کام پسند نہیں۔''

یوں شمائلہ تیمور علی کو جان چکی تھی مگر تیمور علی بس اتنا ہی جان پایا کہ اسے شمائلہ سے محبت ہوگئی ہے۔شمائلہ پیالہ لینے آئی تو تیمور علی باپ کی جگہ پر بیٹھا تھا۔شمائلہ بولی۔''سنا ہے کہ آپ کو یہ کام پسند نہیں۔'' تیمور علی نے کہا صحیح سنا ہے آپ نے مگر یہ پیالہ میں نے بنایا ہے۔''پھر اتنا خوبصورت پیالہ کیسے تیار کیا؟''سلمٰی نے پوچھا۔''یہ تو عالم بے خودی میں تیار ہو گیا مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔'' تیمور علی بولا۔

''میرا مشورہ ہے کہ آپ اس عالم بے خودی میں ہی رہیں تو زندگی میں آپ کبھی ناکام نہیں ہوں گے۔آپ اس جگہ بیٹھ کر مٹی کے بادشاہ لگتے ہیں۔مٹی کا بادشاہ ہونا بڑی بات ہے۔اللہ تعالیٰ نے مٹی سے انسان کو بنا کر مٹی کو بڑا مغرور بنا دیا۔آپ بھی اس مٹی کو ہاتھ میں لے کر مختلف اشکال میں ڈھال کر دیکھیں کیا اطمینان قلب محسوس کریں گے۔'' شمائلہ نے اِدھر اُدھر مٹی کے برتن دیکھتے ہوئے کہا۔ تیمور علی جو دل سے چاہتا تھا کہ اس سے جی بھر کے باتیں کرے۔اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔شمائلہ نے پیالہ لیا اور چلی گئی۔تیمور علی اب سارا دن باپ کی جگہ پر بیٹھا رہتا۔کبھی وہ پیالہ دے جاتی دوبارہ بننے کو، کبھی گلاس تو کبھی گھڑا۔کبھی اس کا پیالہ ٹوٹ جاتا تو کبھی گلاس اور تیمور علی اس کے لئے دھیان اور گیان کی دھونی لگا کر عشق کی اگربتی سلگا کر باپ کی جگہ بیٹھ جاتا۔شمائلہ کی باتیں از سرِنو دہراتا، مٹی میں اس کی صورت دکھائی دیتی رہتی اور پتہ بھی نہ چلتا کب برتن تیار ہو کر اس کے ہاتھ پر ہوتا۔یہ محبت اور عشق کے پھول کو کھلے اب مہینہ ہونے کو تھا۔اس دوران اس نے کئی باتیں شمائلہ سے اور شمائلہ نے اس سے کیں۔اب تیمور علی کھویا کھویا نہ رہا۔وہ ماں کے ساتھ باتیں کرتا خوب ہنستا۔ایک دن اماں نے کہا۔''تیمور پتر! تجھے وہ لڑکی اچھی لگتی ہے؟'' تیمور علی کے چہرے پر قوسِ قزح نے وہ رنگ چھوڑا کہ چھپائے نہ چھپے۔اس کی ہاں کہتی آنکھوں سے چمک پھوٹ نکلی جو محبت کے جگنو نے اپنی دُم میں بھر لی اور بھولے بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانے چل نکلا۔تیمور علی نے اماں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور پانی کا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیا۔تاکہ باہر آتی محبت کو حلق سے اتار کر دل میں چھپا لے۔کسی کو خبر نہ ہو۔بھلا محبت بھی کبھی دل میں چھپی۔یہ تو کسیر کی طرح ہو جاتی ہے جتنا نکالو اتنا ہی دل میں کھب جاتی ہے۔

ایک دن شمائلہ نے تیمور علی کو بتایا کہ اب وہ واپس شہر جا رہی ہے۔تیمور علی تڑپ اٹھا۔میں ایسے بھلا رہ سکتا ہوں تمہارے بغیر۔ میں ان مٹی کے برتنوں سے محبت کرتی ہوں تم بھی کرو یہ مٹی چاہے گی تو ہمیں ملا دے گی۔پھر شمائلہ چلی گئی۔تیمور علی کی تو جان سُولی پہ لٹکا گئی۔

اُسے پتہ ہی نہ چلتا کب دن چڑھا، ڈھلا اور رات ہوئی۔بس شمائلہ کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتا۔دوبارہ ملنے کی بھی کوئی آس نہ امید، نہ پتہ۔بس وہ رات دن اس کی باتوں میں کھویا رہتا نہ کھانے پینے کا ہوش۔بخار میں کئی دن جلتا رہا۔ماں کی محبت بھی اس کی بے چینی کو کم نہ کر پائی۔وہ ایک ہی بات سوچتا۔''ربّا میرے سوہنیا سچیا ربّا اسے میری زندگی میں کیوں شامل کیا۔وہ کیوں آئی اور چلی گئی؟'' گزرتا وقت اس کی محبت کو کم نہ کر سکا۔البتہ اُسے اس محبت کو دل کی گہرائیوں میں کالے پانیوں میں چھپانا آ گیا۔ابا چکنی مٹی کو گوندھ رہا تھا۔اس کی خوشبو سے سارا گھر مہکا ہوا تھا۔اچانک تیمور کو لگا شمائلہ آ گئی۔اس نے کہا تھا مجھے مٹی کی خوشبو بہت اچھی لگتی ہے۔ جب بھی مٹی کی خوشبو مہکے جان لینا میں نے بھی تمہیں یاد کیا اور جس دن مٹی سے خوشبو اڑ گئی سمجھنا شمائلہ جان سے گزر گئی۔تیمور علی بھاگ کر ابا کے پاس بیٹھ گیا اور مٹی گوندھنے میں مدد کرنے لگا پھر شام تک تیمور علی مٹی سے شمائلہ کی باتیں کرتا رہا۔مٹی کے برتنوں کا ڈھیر لگتا رہا۔ ہر برتن سے ایک ہی خوشبو پھوٹ رہی تھی، محبت کی خوشبو۔سارا گھر مہکتا رہا۔شمائلہ اپنی چوڑیوں کے جلترنگ بجاتی سارے گھر میں گھومی پھری۔تیمور علی نے اسے خدا حافظ اس وقت کہا جب ابا نے آ کر کہا۔''پُتر اب بس کر باقی کام صبح کر لینا۔'' وہ مسکرا دیا جیسے ابا نے کہا ہو۔باقی پریم کتھا شمائلہ کو کل سنا دینا۔تیمور علی نے مٹی سے لتھڑے ہاتھ یوں اٹھائے جیسے کسی کو خدا حافظ کہا جاتا ہے۔

محبت سے عشق کی تڑپ تک کی کہانی بڑی ہی دلگداز ہے، محبت کی یاد کا تیر دل کو یوں چیرتا ہے کہ گرم گرم خون کے قطرے دل پر ہی

گرتے ہیں اور آگ لگا دیتے ہیں۔ یہ آگ کی بھڑ کی سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے دنیا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ یہ پوری طرح جلاتی ہے نہ کوئلہ بننے دیتی ہے۔محبت کو پانے کی طلب آگ پر دھری ہانڈی کی طرح ہوتی ہے۔ جو آہستہ آہستہ پکتی ہے اور خوب خوشبو چھوڑتی ہے۔ ہانڈی اندر باہر سے پکتی ہے۔ ذرا سا پانی باہر ڈالو ہانڈی دو منٹ میں اسے اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ جب خوب پک جاتی ہے آگ بجھا بھی دو ڈھکن اٹھا کر دیکھو پکنے کا عمل پھر بھی جاری ہے۔ باہر سے پُر سکون مگر اندر کا الاؤ نہیں بجھتا۔ یہ اس وقت بجھتا ہے جب وجود ختم ہونے، سرد ہونے پر خاموش لبوں پہ سجا لیتا ہے۔ وہ تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں، بھیڑ میں بیٹھ کر تنہا ہوتا ہے۔ وہ محبوب کی یاد میں اتنا محو ہوتا ہے کہ لگتا ہے بھول گیا۔ پھر دل سے صدا آتی ہے نہیں یاد کا عمل دل و دماغ دونوں دہرا رہے ہیں۔ دنیا کے بکھیڑے بھی عاشق اور محبوب کو دُور نہیں کر پاتے۔

تیمور علی نے بھی خود کو شمائلہ کی یاد کے سپرد کر دیا اور مٹی کی خوشبو کو شمائلہ کی یاد کی طرح بسائے اسی جگہ پر ہمیشہ کے لئے بیٹھ گیا۔ جہاں بیٹھنا اسے پسند ہی نہ تھا۔ اب وہاں سے اٹھنا اور اٹھنے کا تصور ہی محال لگتا۔

کئی سال بعد شمائلہ سے ملنے سلمٰی شہر آئی تو اس نے بتایا کہ ''تیرا فلسفۂ محبت تو بڑا کامیاب رہا۔ تیمور علی اب اپنے آبائی پیشہ سے جڑ کر رہ گیا ہے۔ اس نے خاصی ترقی کر لی ہے اس کے بنائے برتن اب دور دراز کے ممالک میں بھی پسند کئے جاتے ہیں، اچھا یہ تو بتا ''کب پیا گھر سدھار رہی ہو۔ دوسروں کو تو محبت کرنا سکھاتی ہو خود کب کر رہی ہو؟'' سلمٰی چہکتی رہی شمائلہ یہ سوچ کر رہ گئی کہ جانے کب مٹی سے کھیلنے والے تیمور کی محبت اس کے دل میں بھی مہک اٹھی۔ اب تو پیا گھر نہ ہی سدھاروں تو اچھا ہے۔ ورنہ دو دھاری تلوار پر چلنا پڑے گا۔ اس کا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ محبت کرنا آسان ہے مگر Pretend کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر اسے پتہ بھی نہ چلا کب اس نے دعا مانگی یا اللہ! تیمور سے ملا دے یا پھر اپنی امانت لے لے مگر تیمور سے ملنے میں دنیاوی اسٹیٹس، خاندانی وقار حائل تھا۔

ایک صبح تیمور علی مٹی گوندھنے لگا تو پانی اور مٹی نے مل کر کوئی خوشبو نہ چھوڑی۔ تیمور علی چونکا خوشبو اڑ گئی اور شمائلہ......؟ مٹی اس کے ہاتھ سے گر پڑی وہ ایک طرف کو لڑھکا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹی کی خوشبو اور محبت وہاں گلے مل رہے تھے۔ تیمور علی نے مسکرا کر دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

’’خالہ فاطمہ‘‘

میں اپنے روزمرہ کے کاموں سے فارغ ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو خالہ فاطمہ کھڑی تھی۔ خالہ فاطمہ بہت دوراندیش، سمجھ بوجھ والی خاتون تھیں۔ ہمیشہ جہاں بیٹھتی دین کی بات کرتی تھیں۔ دنیاداری کی بہت کم باتیں کرتی تھیں۔ کبھی انہوں نے مہنگائی کی، کم آمدنی، خرچ زیادہ، گھریلو پریشانیوں کا تذکرہ نہ کیا۔ ان کے سامنے کسی بھی پریشانی کا تذکرہ کرلو۔ ان کا کہنا ہوتا۔ ’’بیٹی یہ وقت کون سا رُکا رہنے کا ہے۔ یہ بھی گزر جانا ہے۔ بس اللہ ہمارا ایمان ہر حالت میں سلامت رکھے۔ آمین۔

میں خالہ فاطمہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ انہیں اندر آنے کو کہا۔ وہ صاف ستھرا گھر دیکھ کر بولیں۔ ’’ماشاءاللہ بیٹی ابھی دس بجے ہیں تم تو سارے کام نبٹا بیٹھی ہو۔ سویرے اٹھنے کا یہی تو فائدہ ہے...... پھر تسلی سے پانچ نمازیں بھی قائم کرلیتی ہوگی۔‘‘ شکر ہے۔ خالہ دُعا کریں اللہ اور ہمت دے۔

خالہ کہاں سے آرہی ہیں؟ ساتھ ہی میں نے استفسار کیا تو بولیں بیٹا میرا بھانجا نعیم ہے نا اس کی طرف آئی تھی۔ بہت پریشانی میں پڑ گیا ہے۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

خالہ کا بھانجا ہماری کالونی میں ہی رہتا تھا ہمارا بھی ان کے ساتھ اچھا ملنا ملانا تھا۔ مگر میں کم ہی جاتی تھی ان کی طرف، کیونکہ وہ نئے نئے امیر ہوئے تھے اور اپنا ماضی بھلا بیٹھے تھے۔ ان کی اور ان کی بیگم کی باتیں مجھے کوفت میں مبتلا کردیتی تھیں۔ ابھی پچھلے دنوں ہی تو انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی اور چھوٹی کا نکاح کیا تھا۔ بڑی شاندار سی تقریب کا اہتمام کیا۔ شادی کیا فیشن شو تھا اور ان کی بیگم بڑے فخر سے بتا رہی تھیں کہ ناعمہ کو لڑکے نے ایک شادی میں ڈانس کرتے ہوئے پسند کرلیا تھا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ نمی ڈانس میں کتنی Perfect ہے۔ پھر خوبصورتی میں بھی تو کم نہیں، برامت ماننا پوری کالونی میں نمی جتنی خوبصورت لڑکی تو ہے نہیں۔ تم نے تو اپنی بیٹیوں کو بالکل ہی مولوانیاں بنا رکھا ہے۔ ذرا انہیں بھی باہر کی ہوا لگواؤ۔ ورنہ کہاں رشتے ڈھونڈتی رہوگی۔ سیدھی سی بات ہے۔ ہم تو رشتہ ڈھونڈنے کے چکروں سے بچ گئے۔ چھوٹی روبی (روبینہ) اس کا بھی اسی خاندان میں کر دیا ہے۔ نمی کی ساس کا بھانجا ہے۔ دونوں بہنیں خوش ہیں کہ ایک ہی گھر سے لڑکیاں مل گئیں۔ وہ تفصیل بتاتی جارہی تھیں اور ساتھ ساتھ مجھے مشورہ دینا بھی نہ بھولیں۔

’’اتنا اچھا تو سب کچھ تھا، پھر کیا ہوا؟‘‘ میں نے خالہ فاطمہ سے پوچھا۔

ہونا کیا بیٹا، یہ ہمارے اپنے اعمال ہی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہم مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ نعیم کا اس کے بڑے بھائی نے کتنا ساتھ دیا۔ اسے پالا پوسا، پڑھایا، شادی کی اور اپنے ساتھ اٹھارہ سال رکھا۔ کاروبار کرایا، یہ احسان فراموش، جیسے ہی کاروبار جما دیکھا اس نے تو اپنی اوقات دکھا دی۔ پہلے تو گھر الگ کیا کہ ہم تنگ جگہ پہ گزارہ نہیں کرسکتے۔ 20 مرلہ کی کوٹھی لی اس نے تو جگہ بدلنے کے ساتھ ساتھ بچیوں کے نام تو کیا اپنے طور طریقے ہی بدل دیئے۔ ناعمہ کو نمی اور روبینہ کو روبی بنا دیا۔ کم عقلی تو دیکھو پیسہ کیا آیا خاندان

میں ہر تقریب میں اپنے مال و دولت، کپڑوں، جوتوں اور فیشن کی بات کرتا۔ اس کے رنگ میں بچوں اور بیوی نے بھی تو رنگنا تھا۔

میں نے تو ایک مرتبہ کہہ دیا۔ ''بیٹا نعیم! اب اللہ کا شکر بھی کیا کرو۔ بڑے مشکل وقت کے بعد تمہارا اچھا وقت آیا۔ سنبھل سنبھل کر چلو بیٹا، پیسہ دکھا دکھا کے خرچ نہ کرو۔ بلکہ اس سے کسی ضرورت مند کی بھی ضرورت پوری کرو۔ کسی غریب رشتہ دار کا دل نہ دکھانا لیکن اس نے کبھی نہ میری سُنی۔ ابھی عید پہ بڑی بھاوج نے بچوں کو عید بھیجی۔ نعیم اور اس کی بیوی کو سوٹ بھیجے لیکن اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ اب ہم اس طرح کے کپڑے نہیں پہنتے ہمارے تو دبئی سے آتے ہیں۔ بڑی بیٹی کا تو نخرہ دیکھو۔ وہ تو جوتا بھی وہیں خریدنے جاتی ہے۔ ماں دس، دس ہزار تو بالوں پہ لگا دیتی ہے۔ وہ دن بھول گئی ہے جب ان کا دیا کھاتے تھے اور پہنتے تھے۔ اسی نخرے اور غرور و تکبر نے ڈبو دیا ہے نعیم کو۔''

خالہ فاطمہ بڑے متحمل مزاج کی خاتون تھیں۔ اس خاندان بھر کی بزرگ ہیں اس لئے کوئی بھی ان کی بات کا برا نہ مانتا تھا۔

''خالہ ہوا کیا؟'' اب مجھے بھی بے چینی ہو رہی تھی آخر پوچھ ہی لیا۔

''بیٹی ہونا کیا پچھلے ماہ کار کے ایک حادثہ میں اپنی ٹانگیں کٹوا بیٹھا۔ ابھی کل ہی ناعمہ کو طلاق ہوگئی ہے۔ لڑکے کو اعتراض ہے کہ یہ میرا حکم نہیں مانتی۔ حکم کیا؟ اسے کہتا تھا میرے ساتھ بیٹھ کر شراب پیئے۔ بچی نے انکار کر دیا اس نے نشے کی حالت میں اسے اتنا مارا کہ ہسپتال میں داخل ہے۔ بے چاری بچی پیٹ سے تھی، اس خوشی سے بھی محروم ہوگئی۔ اب شاہدہ رو رہی تھی کہ چھوٹی کو بھی اس خاندان میں نہیں رہنے دوں گی۔ نعیم کی حالت تو اتنی بری ہے کہ اس کے آنسو نہیں رک رہے۔

میں نے سمجھایا۔ ''بیٹا یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اب صبر کرو مگر غلطی تمہاری اپنی بھی ہے۔ جب بے دین لوگوں سے رشتہ جوڑو گے اور اپنی دولت کے بل بوتے پر اتراتے پھرو گے۔ بچوں کو اپنے دینِ اسلام سے ہٹاؤ گے تو پھر یہ پریشانی کے دن دیکھنے کو تو ملیں گے۔ بیٹا اللہ کے دیئے ہوئے میں نہ اسراف کرو۔ نہ بخل درمیانہ راستہ اختیار کرو۔ اسی میں بھلائی ہے۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اپنے اللہ کو منالو۔ اس سے توبہ کرو اللہ تم سے ناراض ہے۔ اس کی مخلوق سے اچھا برتاؤ کرو وہ خوش ہو جائے گا۔ وہی تمہیں ان سب پریشانیوں سے نجات دلائے گا۔

بیٹا! ہمارے ابا جان کہتے تھے کہ پرس میں ہزار کے نوٹ ہوں تو تب کچھ لیتے وقت ہزار کا نوٹ نہ نکالو بلکہ چھوٹے نوٹ نکالو۔ اس سے دیکھنے والے کو احساس کمتری نہ ہوگا۔ جب آپ دوسروں کو دکھا دکھا کر پہنو گے۔ کھاؤ گے اور خرچ کرو گے تو معاشرے میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگا۔ چھینا جھپٹی ہوگی، لوگ پیسے والے کی عزت اور غریب کی بے قدری کریں گے۔ سادگی اختیار کرو، سادگی سے غریبوں کا بھی بھرم رہ جاتا ہے۔ خالہ فاطمہ یہ سب بتا کر پانی کا گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ پینے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''خالہ میں تو ان کی عامیانہ گفتگو سے اس قدر بددل تھی کہ میں نے تو ان کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔''

''لیکن بیٹی اب وہ مصیبت میں ہیں، پریشان ہیں۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت میں اپنے بہن بھائی کو اکیلا نہ چھوڑے۔ شاید ایسے بھولے بھٹکے لوگ ہمارے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر دین سے محبت کرنے لگیں، کوشش تو کرتے رہنا چاہیئے۔ کوشش کبھی ترک نہیں کرنی چاہیئے۔ ہاں بیٹی فاطمہ اور عائشہ ٹھیک ہیں؟ ان کی پڑھائی کیسی ہو رہی ہے۔ مجھے تمہاری بات بہت اچھی لگتی ہے۔ کہ تم انہیں دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی آراستہ کر رہی ہو۔'' میری دونوں بیٹیوں کے نام ان کی دادی نے رکھے تھے اور میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ بڑوں کے رکھے ناموں میں بھی برکت ہوتی ہے۔ اور ان کی خوشی کامیابیاں بن کر بچوں کے سر پر سایہ فگن رہتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بچے ہر میدان میں کامیاب تھے اور مجھے امید ہے کہ ان کے نصیب ہمیشہ بلند رہیں گے۔ کیونکہ ان کی دادی نے پہلی بار جب ان کو پکارا تھا تو پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی تھی۔ میں تو ہر لمحہ اپنے بزرگوں کے لئے دُعا گو رہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے۔ میں جو کچھ بھی ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جب زندہ تھیں تب بھی کبھی اونچی آواز میں ان کے سامنے بات نہ کی تھی۔ اللہ بخشے کبھی کبھی ماں جی کہتی تھیں ''بہو! کبھی تو میری بات سے اختلاف کرلیا کرو۔'' میں کہتی۔ ''ماں جی مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میں نے آپ سے اونچی آواز میں بات کی تو میرا رب مجھ سے روٹھ جائے گا اور میں آپ کی دُعا سے محروم ہو جاؤں گی۔''

میری دادی مجھ سے کہتی تھیں۔ نور بیٹا ہمیشہ بڑوں کا، بزرگوں کا احترام کرنا ورنہ رب روٹھ جاتا ہے۔ پھر میں نے ان سے کہا تھا۔ ''دادی میرے لئے دُعا کرو کہ میرے دل میں ہمیشہ کے لئے اپنے بزرگوں کی عزت کا پھول کھلا رہے۔ میں مرتے دم تک اپنے بزرگوں کی دُعاؤں کے حصار میں رہوں اور میں جانتی ہوں کہ میں آج بھی کسی دُعا کے حصار میں ہوں۔''

یہ کہہ کر میں خالہ فاطمہ کے لئے کھانا بنانے اٹھ گئی۔ میں نے کبھی بھی خالہ فاطمہ کو کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دیا اور ابھی تو مجھے خالہ کے لئے کھیر بھی بنانی ہے کیونکہ انہیں میرے ہاتھ کی بنی کھیر بہت پسند ہے۔

❍......❖......❍

نیلی چھتری

وہ ایک گرم دوپہر تھی، کرن تایا بخشو کی دکان سے نمک اور چینی لینے گئی تھی۔گلی میں ہُو کا عالم طاری تھا۔تایا بخشو اونگھ رہا تھا، کرن کو دیکھ کر آنکھ کھلی تو سوتے جاگتے تایا نے نمک اور چینی الگ الگ لفافوں میں ڈال کر اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو اس کا چھوٹا سا ہاتھ پکڑ کر قریب کرلیا اور اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔اسے لگا کوئی سانپ اس کی کمر پر رینگ رہا ہے۔یہ سانپ اِدھر اُدھر رینگ رہا تھا۔اب کمر سے ہوتا ہوا اس کے فراک میں گھسنے لگا۔اس کا سارا بدن لرز اٹھا۔سیپارہ پڑھانے والی چاچی کی آواز اس کے کانوں میں گونج اٹھی
۔

''لڑکی چھوٹی ہو یا بڑی حوا کی بیٹی کی عزت کانچ جیسی ہوتی ہے۔ٹوٹ گئی تو بس ٹوٹ گئی۔بے داغ چُنری میں لگا داغ کبھی نہیں دُھلتا ہزار جتن کرو۔''

شیطان ہر وقت تاک میں رہتا ہے۔بس اللہ کا نام دل میں جپتے رہو۔پھر بُری گھڑی دور بھاگتی ہے۔میری بچیو! جب شیطان کسی روپ میں وار کرے، خطرے کی گھنٹی بجے تو جان جاؤ یہ انسان نہیں......خود کو مالک کی پناہ میں دے دو۔عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے وہ بتا دیتی ہے۔سب سمجھا سکتی ہے۔

سانپ اب اس کی پنڈلیوں پہ چڑھنے کو تھا جب اس نے نیلی چھتری کی طرف دیکھا۔وہاں بیٹھے ہوئے کو اس نے پکارا، تیز چمکتے سورج نے اس کے آس پاس آگ لگا دی۔نمک اور چینی کے لفافے اس کے ہاتھ سے چھوٹے، لفافے پھٹ گئے، چینی اور نمک بکھرے۔ایک زور کا تھپڑ تایا بخشو کے منہ پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔دس سالہ کرن کے شعور میں بیٹھی چاچی کی باتیں اسے آج سمجھ آ گئیں جنہیں وہ لاپروائی سے سنتی تھی۔

○......❖......○

گڈو

کرموں کی گڈو دنوں میں جوان ہوئی ۔ رنگ و روپ بھی خوب نکالا ۔ وہ چائے پیتے ہوئے گڈو کو کچے صحن میں اِدھر اُدھر بھاگ بھاگ کر کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ گڈو نے بہت جلدی گھر گرہستی سیکھ لی ۔ سولہویں سال میں ابھی قدم نہ رکھا تھا۔ اس نے ہانڈی چولہا سب سنبھال لیا۔ اماں حویلی میں جو صبح کی گئی تو شام کو ہی لوٹتی ۔ گڈو اس کے آنے تک سب کام نپٹا چکی ہوتی ۔ مزاج کی تیز تھی ۔ غصہ آتا تو بدلحاظ ہو جاتی ۔ کرموں اکثر اپنی گھر والی کو کہتا......

''شیداں! اپنی گڈو میں کوئی کمی نہیں ۔ بس غصہ آئے تو کسی کا لحاظ نہیں کرتی ۔''

''گڈو کے ابا وقت کے ساتھ سمجھ جائے گی ۔ سمجھدار تو بہت ہے جب بھی میرے ساتھ حویلی جاتی ہے ۔ بی بی جی کہتی ہیں ۔ اس کو حویلی میں چھوڑ جا۔ قرآن پاک بھی پڑھ لے گی میں اس کا بیاہ بھی کر دوں گی ۔'' شیداں لہسن چھیلتے ہوئے بولی ۔

''نہ گڈو کو تُو حویلی نہ لے جایا کر ۔ شیداں ہماری بیٹی کی اٹھان گاؤں میں سب لڑکیوں سے جدا ہے ۔ میرا دل نہیں مانتا۔ تُو اس کو گھر سے نہ نکلنے دیا کر ۔ میں تو دیکھ رہا ہوں کوئی اچھا رشتہ ملے تو اس کو اس کے گھر کا کروں ۔'' کرموں نے سامنے آتی گڈو کو دیکھ کر اپنا ارادہ اور خدشہ ظاہر کیا۔

شیداں صبح سے حویلی گئی ہوئی تھی ۔ گڈو نے سارے کام نپٹانے میں بڑی پھرتی دکھائی ۔ آج اس نے اپنی سہیلی سجو کے ساتھ اس کے ابا کو کھیتوں میں روٹی دینے جانا تھا۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں ۔ ذرا سی فرصت ملتی تو ایک دوسرے کی طرف چلی جاتیں ۔ ان کا پروگرام تھا۔ روٹی پہنچا کر واپسی پہ ٹیوب ویل کے پاس جا کر بیٹھیں گی ۔

سجو کھانے کا ڈبہ لئے آئی تو گڈو نے جلدی سے دروازے کو تالا چڑھایا۔ کھیتوں کی طرف چل دیں ۔ آج کرموں بھی وہیں تھا۔ دونوں کھانا کھانے لگے تو گڈو اور سجو آم کے درخت کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں ۔ کچے آموں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ۔ طوطے نے ایک آم کُتر کر پھینکا تو گڈو اٹھا کر مزے سے کھانے لگی ۔ کرموں نے منع کیا تو بولی ۔

''ابا مجھے کچھ نہیں ہوگا فکر نہ کر ۔'' یہ کہہ کر کچر کچر کھانے لگی ۔

واپسی پہ دونوں نے ٹیوب ویل کے پاس جا کر ٹھنڈے ٹھار پانی کے چھینٹے منہ پر مارے تو گرمی کا احساس قدرے کم ہو گیا۔ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھیں مستقبل کے تانے بانے بُنتی رہیں ۔ سجو کا منگیتر شہر سے آنے والا تھا۔ سجو نے اس کے لئے سفید کرتے پر کڑھائی کرنے کا سوچا تھا۔ مگر وقت کم تھا۔

اس نے گڈو سے کہا۔

''تم میری مدد کرواؤ تو کام بروقت ہو سکتا ہے ۔ روز شام کو میری طرف آ جایا کرو ۔ باتوں کے ساتھ ساتھ کڑھائی کریں گے ۔''

''گڈو نے اس شرط پر ہامی بھری کہ تم بھی میرے ساتھ تکیوں کے غلاف تیار کرنے میں مدد کرو گی۔''

سجو اور گڈو کے گھر کے درمیان ماسی رجو کا تندور تھا۔تندور کے ساتھ گلی تھی۔ جو سیدھی حویلی کی طرف جاتی۔

مولوی صاحب عصر کی نماز پڑھنے کے لئے گلی میں داخل ہوئے۔ان کا رخ حویلی کی طرف تھا۔حویلی کے بائیں طرف مسجد تھی۔ گڈو نے مولوی صاحب کو آتے دیکھا تو احتراماً رک گئی۔وہ جیسے ہی تندور کے پاس سے گزرے۔گڈو بھاگتی ہوئی گلی کے پہلے گھر میں داخل ہوئی۔سجو ناراضگی سے بولی۔

''اتنی دیر کا ہے کو لگائی......نہ آتی دل نہیں چاہتا تھا تو کوئی مجبوری نہ تھی۔''

''سجو ابا سویا ہوا تھا۔اس کے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔آج صبح سے ہی اس کی طبیعت خراب ہے۔دوائی لے کر سویا تو بہت دیر تک سویا رہا......تم ناراض نہ ہو آج آدھا کام ختم کر کے ہی جاؤں گی......''

گڈو نے اپنی پیاری سہیلی کو مناتے ہوئے کہا۔

عشاء کی اذان ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔وہ تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔ٹانکے سے ٹانکا نکالتی گڈو اب دیر ہو جانے پر فکر مند تھی ۔سجو کی ہر بات کا ہوں ،ہاں میں جواب دے رہی تھی۔آخری ٹانکا پکا کرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

گلی میں سناٹا طاری تھا۔سجو کی اماں نے کہا بھی۔''گڈو رُکو میں ساتھ چلتی ہوں۔مگر اسے سنائی نہ دیا۔گلی میں آئی تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔چاند کی چودہ تھی۔ہر سُو دودھیا چاندنی اپنے پاؤں دھر چکی تھی۔گڈو تیز قدموں چلتی تندور تک آئی۔تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ اس کا دوپٹہ سر سے پھسل گیا۔بکھرے بال چہرے پر آگرے۔اسے کچھ نظر نہ آیا۔وہ کسی سے ٹکرائی۔بال پیچھے کرتے ہوئے دیکھا تو بی بی جی کا چھوٹا صاحبزادہ پیر حسنین تھا۔اس سے پہلے کہ گڈو معذرت کرتی اس نے گڈو کا ہاتھ پکڑ لیا۔گڈو کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی ۔آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ایک تھپڑ ان کے منہ پر رسید کر کے آگے بڑھ گئی۔پیر حسنین نے اپنے دائیں گال پر ہاتھ رکھ لیا جہاں اب انگارے پھوٹ رہے تھے۔

گڈو اپنے گھر میں داخل ہوئی تو مڑ کر دیکھا۔پیر حسنین ابھی بھی وہیں کھڑے بے یقینی کی کیفیت میں تھے۔

اگلے دن حویلی میں ہنگامہ برپا تھا۔لاڈلا صاحبزادہ بی بی جی پر برس رہا تھا۔

''شیداں کام ٹھیک سے نہیں کرتی میرا کمرہ تو کبھی صاف نہیں ہوتا۔اس کی تو ہڈیوں میں درد ختم نہیں ہوتا تو کام کیا کرے گی۔ میری کوئی چیز ٹھکانے پہ نہیں۔میرا کمرہ کسی سے ٹھیک کروائیں ورنہ میں شہر چلا جاؤں گا۔''

اسے جب بھی غصہ آتا شہر جانے کی دھمکی دیتا۔ماں صدقے واری جاتی۔

''نہ میرا بیٹا......حویلی سنسان ہو جائے گی۔تیرے دم سے تو یہاں رونق ہے۔''

بی بی جی نے اسی وقت شیداں کو حکم دیا۔''جا کر گڈو کو لے آوہ آج کچھ مدد کروا دے۔شیداں مجبوراً اسے لے آئی۔گڈو نے بہت کہا۔

''اماں میرے سر میں بہت درد ہے......کل چلی جاؤں گی۔'' مگر شیداں کو اپنی نوکری کی فکر تھی۔جب سے کرموں بیمار رہنے لگا تھا ۔شیداں کی محنت سے ہی گھر کا چولہا گرم ہوتا تھا۔

بی بی جی نے گڈو سے کپڑے دھلوائے۔پھر کمروں کی صفائی کرنے کو کہا۔رات کے واقعہ سے گڈو سو نہ پائی تھی۔اس کی طبیعت اچھی نہ تھی۔وہ غیر حاضر دماغی سے کام میں لگی تھی۔شاداں نے اسے اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

''مجھے بھوک نہیں اماں۔''

شیداں کھانا کھا کر ذرا ستانے کو لیٹ گئی۔ بی بی جی نے گڈو سے کہا۔

''پہلے میرے لعل حسنین کا کمرہ ٹھیک کر دو۔ اچھے سے کرنا اسے کوئی شکایت نہ ہو۔ جانے کیوں کل سے آگ بگولا ہوا ہے۔''

گڈو خاموشی سے اٹھی اور کمرے کی جھاڑ پونچھ کرنے لگی۔ کمرے کی ہر چیز صاف ستھری اپنے ٹھکانے پر تھی۔ بس بیڈ کی چادر سلوٹ زدہ تھی۔ آدھی کارپٹ پر پڑی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر آدھ جلے سگریٹ سے بھرا ایش ٹرے تھی۔ گڈو نے چادر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جھاڑی۔ اتنے میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو گڈو پیلی پڑ گئی۔

جب اسے دروازے سے باہر دھکا دیا گیا تو وہ برآمدے کے فرش پر اوندھے منہ گری۔ کسی نے بھی اس کے لیر و لیر ہوتے دوپٹہ کو نہ دیکھا۔ سب دوپہر کو کھانے کے بعد قیلولہ کے عادی تھے۔ شاداں باورچی خانہ کے فرش پر تھکی بے سُدھ پڑی تھی۔ گڈو اماں کو بتائے بغیر گھر آ گئی۔ اسے بڑی ذات پر اٹھایا ہاتھ بہت مہنگا پڑا۔

O......❖......O

وصلِ یار

مجھے سکول جانے کو دیر ہو رہی تھی ۔ چڑیا آ ہی نہیں رہی تھی ۔ میں کب سے پلیٹ میں دانہ لے کر کھڑی تھی ۔ اس چڑیا سے میری دوستی ایک ہفتہ پہلے ہی ہوئی تھی ۔ چھت پر گری چُوں چُوں کرتی جا رہی تھی ۔ میں نے اُٹھایا پانی پلایا ۔ اس کی ٹانگ زخمی تھی ۔ میں نے دوا لگا کر پٹی باندھ دی ۔ تب سے ہم دونوں سہیلیاں بن گئیں ۔

''دیدی مما بلا رہی ہے ۔''

چھوٹے بھائی عروش نے آ کر کہا تو چڑیا بھی پُھر سے آ گئی ۔

میں نے دانہ اس کے آگے رکھا، بیگ اٹھایا سکول چل دی ۔ میرا میٹرک ہونے جا رہا تھا ۔ میں نے سخت محنت شروع کر رکھی تھی ۔

ہر روز چڑیا کو کہتی ۔

''میرے لئے Pray کرنا ۔''

میں میٹرک سے ہائر سیکنڈری کلاسز میں آئی تو پڑھائی کا بوجھ پہلے سے دُگنا ہو گیا ۔ میری چڑیا سے دوستی برقرار رہی ۔

ایک دن چڑیا اپنے ساتھ ایک چڑا بھی لے آئی ۔

میں اسے دیکھ کر ہنس پڑی ۔ ''کہ راجا میاں کہاں سے اُڑا لائی ہو......؟'' وہ چڑا عام سے مختلف تھا ۔ خوبصورت گہرے قرمزی رنگ کا تھا ۔ اب وہ دونوں آتے تو ان کی چُوں چُوں سے ایک رونق سی لگ جاتی ۔

ڈیڈی ایک دفتر میں ملازم تھے ہم دو بہن بھائی تھے ۔ مما ایک سکول میں نرسری کلاس کی ٹیچر تھی ۔ ہم ہر اتوار کو قریبی پارک میں سیر کرنے جاتے وہاں درختوں پر بیٹھی چڑیاں مجھے اپنی سی لگتیں ۔

میرے ایف اے کے فائنل ایگزیم تھے جب چڑیا نے آنا چھوڑ دیا ۔ میں دانہ رکھ کر آتی مگر میری چڑیا نہ آتی ۔ میں نے مما سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو بھائی بولا ۔

''عیشل اس نے شادی کر لی ہو گی ۔''

ہم سب ہنس پڑے میری بی اے کی کلاسز سٹارٹ ہو گئی تھیں ۔ اتوار کا دن تھا، گہرے سرمئی بادلوں سے موسم ابر آلود ہو گیا تھا ۔ مما کی طبیعت اچھی نہ تھی میں اور عروش پارک چلے گئے ۔ پارک میں کافی رونق تھی ۔ میں پارک میں واک کرتے ہوئے بھی دُعا کر رہی تھی کہ چڑا میری چڑیا کو خوش رکھے ۔ پارک سے واپس گھر آتے ہوئے میرا جوتا ٹوٹ گیا ۔ عروش بولا ۔ ''دیدی اب ننگے پاؤں ہی چلنا پڑے گا ۔ دور دور تک کوئی موچی دکھائی نہیں دیتا ۔''

میں نے دونوں جوتے اُتارے اور ننگے پاؤں چلنے لگی ۔ ایک لمبا پتلا لڑکا گلے میں گولڈ کی چین پہنے سرخ ٹی شرٹ میں ملبوس مجھے

اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

اس نے اپنی چپل مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ پہن لیں میں بائیک پر ہوں۔''

میں ہچکچائی تو عروش بولا۔

''ڈیڈی پہن لیں گھر کا پتہ بتا دیتے ہیں یہ آ کر لے جائیں گے۔اور شکریہ کے طور پر ہم ایک کپ چائے ان کو پلوائیں گے۔''

وہ لڑکا بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔''

عروش فوراً بولا۔''جوتے کی یا چائے پسند نہیں۔''

وہ ہنس پڑا۔

اس نے بتایا۔''میں آپ کی مما کا سٹوڈنٹ رہ چکا ہوں۔میں کسی وقت ان کو ملنے حاضر ہوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا میں نے اس کی دی ہوئی چپل پہنی اور ہم گھر کو چل دیے۔

ایک خوشگوار سی صبح وہ ہمارے گھر آیا۔مما بہت محبت سے اس سے ملیں۔اس نے کمپیوٹر سائنس میں M.S.C کی تھی اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔مما کی Request پر وہ مجھے اور عروش کی پڑھائی میں مدد کرنے لگا۔وہ شام کو 5:30 پر آتا۔میں اس سے انگریزی ادب پڑھتی۔پتہ ہی نہ چلا۔ہم گھر والے کب اس کے عادی ہو گئے۔وہ آتا شام کی چائے بنتی۔پڑھائی ہوتی وہ ڈیڈی سے لمبی لمبی بحث کرتا۔رات شام کی طرف بڑھتی تو وہ چلا جاتا۔اس کے جانے کے بعد ہمارے گھر میں سناٹا چھا جاتا۔یہ روٹین سال بھر رہی۔

ایک دن چڑیا چلی آئی۔بڑی کمزور سی،سُست سی۔میں نے دانہ اس کے آگے رکھا۔پانی کی پیالی بھی اس نے دو تین دانے چگنے کے بعد پانی پیا پھر بیٹھی رہی۔شام تک نہ گئی تو میں نے سٹور سے ایک پرانا پنجرہ نکالا۔جس میں کبھی ہمارا پیارا مٹھو میاں رہتا تھا۔ایک دن ہمیں چھوڑ کر رفو چکر ہو گیا۔میں نے پنجرہ صاف کیا اور چڑیا کو اس میں بند کر کے صحن میں لٹکا دیا۔

کسی کی بے وفائی مار ڈالتی ہے......زندہ رہنے کی خواہش نہ جانے کہاں کا رُخ کر لیتی ہے۔پھر گزرتے وقت کی گرد یادوں کو دھندلا کر دیتی ہے۔

چڑیا بھی اب ہمارے ساتھ رہنے کی عادی ہو گئی۔اب چڑیا کی چوں چوں گھر بھر میں گونجنے لگی۔شعری آیا تو اسے بھی چڑیا اچھی لگی۔

عروش نے اسے بتایا کہ''چڑے نے اس کے ساتھ بے وفائی کی اور اب یہ ہمارے پاس رہے گی۔''

شعری بہت ہنسا۔

میرا بی اے کا رزلٹ آیا میں نے فرسٹ پوزیشن لی۔سب بہت خوش تھے۔

شعری نے کہا۔''تم انگریزی میں ایم اے میں داخلہ کی تیاری کرو۔''

میں نے کہا۔''ٹھیک۔''

ڈیڈی نے یونیورسٹی میں میرا ایڈمیشن کروا دیا۔شعری بہت دن تک نہ آیا۔ہم انتظار ہی کرتے رہے۔

میں نے ممی سے کہا۔ ''شعری آئے گا تو ہم ایک پارٹی کریں گے۔''

میں نے اسے دینے کے لئے ایک Thank You کا کارڈ اور Wrest-Wacth لی اس پر شام 5:30 کا ٹائم جو اس کے آنے کا ہوتا تھا سیٹ کیا اور پیک کر کے رکھ دی۔ مگر شعری کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ مجھے ہر دستک پہ اس کے آنے کا گمان ہوتا۔ شام سے ہی طبیعت بے چین ہو جاتی۔ جوں جوں وقت گزرتا میرا اضطراب بڑھتا جاتا۔ میں چڑیا کے پاس جا کھڑی ہوتی اس سے باتیں کرتی۔

''مینا! وہ آج بھی نہیں آیا (چڑیا کا نام میں نے مینا رکھ دیا تھا)۔''

اس نے سر جھکا لیا میرے درد کو صرف وہی جانتی تھی۔ اب میں یونیورسٹی سے آ کر مینا سے خوب باتیں کرتی۔

''مینا! تمہیں بھی شعری یاد آتا ہے......؟ مینا اس کی ہنسی بے آواز تھی۔ مگر جب بات کرتا تھا۔ تو آواز میں خوبصورت گنگناہٹ ہوتی تھی...... کیا تمہیں بھی اپنا دوست یاد آتا ہے۔ جو تمہیں چھوڑ کر چلا گیا......تم تو اُڑ سکتی ہو...... کیوں نہ اسے ڈھونڈنے گئی...... میں تو شعری کو ڈھونڈنے نہیں جا سکتی۔

مینا! مجھے شعری بہت اچھا لگتا تھا۔ مجھے آج بھی وہ دن نہیں بھولا جب میں سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی تھی تو اس نے مجھے اپنا جوتا دے دیا تھا۔''

میں مینا کو اپنے دل کی باتیں سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھی۔ میری کوئی سہیلی نہ تھی۔ بس ڈائری لکھتی یا مینا سے ہر بات کرتی تھی۔

میں نے مینا کے پانی والے کٹورے کا پانی بدلا۔ اسے اچھی طرح دھویا۔ تازہ پانی بھر کر رکھا اور پھر مینا سے باتیں کرنے لگی۔

''مینا! میرا دل چاہتا ہے کہ میں شعری کو ڈھونڈنے جاؤں۔ وہ مل جائے تو اس سے خوب لڑوں۔ اس کی ساری چیزیں بکھیر کر آؤں تاکہ اسے بھی معلوم ہو کہ بکھری یادوں کو سمیٹنا اور سنبھالنا، کتنا مشکل ہوتا ہے۔'' پھر مینا کو اپنی ایک نظم سنائی۔

کتنا مشکل ہے تم سے محبت کرنا
رات سے دن کرنا
دن سے رات کرنا
قسم سے جاناں! بہت مشکل ہے
تم سے محبت کرنا

مینا چوں چوں کرنے لگی۔

میں نے مینا کے پروں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''مینا تم دُعا کرو شعری جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔''

''عیشل اب بس کرو۔ مینا سے جانے کیا کیا کہتی رہتی ہو۔ آؤ ذرا رسوئی میں رات کا کھانا بنانے میں میری مدد کرو۔'' مما نے مجھے آواز دی۔

اب مجھے بالکل بھی غصہ نہ آتا۔ میں چپ چاپ ہر کام کر دیتی حالانکہ میں کام چور تھی۔ رسوئی میں جانے سے تو مجھے چڑ تھی مگر اب میں رسوئی میں جاتی تو مجھے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ میں سارے کام بڑے طریقے سلیقے سے کرتی۔ جب میں کافی دیر تک رسوئی سے نہ نکلتی۔ ایسے میں مما کی آواز مجھے چونکا دیتی۔

''میری جان اب نکل بھی آؤ رسوئی سے کیا بات ہے......؟ کیوں کھوئی کھوئی سی رہتی ہو......؟''

مما کی آواز مجھے یادوں کے چنگل سے چھڑاتی......مگر میں بار بار یادوں کی کڑی ملانے میں لگی رہتی ۔
رات ہوگئی تھی ۔ہم سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔شعری کے جانے کے بعد ہم سب خاموش سے ہو گئے تھے ۔جب بھی اس کا نام لیا جاتا ۔ڈیڈی ''اوہو'' کہتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھرتے اور کہتے پتہ نہیں کہاں چلا گیا شعری......؟ بھلا نوجوان تھا۔
میں بستر پر سونے لیٹتی تو میرے بستر پر بے زاری اور وحشت آبیٹھتی ۔جو میرے اندر کڑواہٹ بھر دیتی ۔میری آنکھیں جلنے لگتیں ۔نیند نہ آتی ۔پھر نہ جانے رات کا کون سا پہر ہوتا میں روتے روتے سو جاتی ۔
زندگی ایک ہی انسان کے اردگرد گھومتی ہے ۔ایک ہی ذات محور بن جاتی ہے ۔اس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا ۔موسم کی شدت محسوس ہوتی ہے نہ کھانے پینے کی رغبت رہتی ہے ۔بس محبوب کی یاد......صرف یاد دل میں بسی رہتی ہے ۔
میں صبح جلدی اٹھنے کی عادی تھی ہر روز قرآن پڑھنا میرا معمول تھا۔ میں قرآن کو سینے سے لگائے بیٹھی اپنے اللہ سے باتیں کر رہی تھی ۔ مجھے جب سے شعری کی محبت کا ادراک ہوا تھا ۔میری جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی ۔ ہر لمحہ دل بے چین......سوکھے پتہ کی طرح کانپتا رہتا۔شعری کے بارے میں عجیب وغریب گمان و وہم ستانے لگتے ۔
اگر چہ میرے اور اس کے درمیان کوئی وعدہ نہ ہوا تھا ۔بس کچھ یادیں ، باتیں اشارے کنایے تھے جو وقت اور زمانہ کی روایات سے ہٹ کے تھے ۔ جو میرے دل کو یقین سے ہمکنار کرتے تھے کہ شعری بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا......وہ سب...... جب جذبے سچ بولتے ہیں ۔خاموشی کچھ کہتی ہوئی لگتی ہے ۔
ڈیڈی اور مما چائے پی رہے تھے مجھے دیکھ کر باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے ۔دونوں کا موضوع شعری تھا ۔وہ جانتے تھے کہ میں اسے یاد کرتی ہوں ۔ والدین واحد رشتہ ہے جو بچہ کی دل کی حالت فوراً جان لیتے ہیں ۔انہیں اپنی اولاد کی پسند و ناپسند کا علم ہوتا ہے مگر تقدیر کے سامنے بے بس ہوتے ہیں ۔
عیشل آج یونیورسٹی نہیں جاؤ گی......؟
مما نے مجھے بے وقت مینا کے پنجرے کی صفائی کرتے دیکھا تو بولیں ۔
میں ہنوز پنجرہ صاف کرتی رہی اور نفی میں سر ہلا دیا۔
عروش اپنے کسی کورس کے سلسلہ میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔آج مجھے اور مینا کو اکیلے رہنا تھا۔مما اور ڈیڈی اپنے اپنے کام پر جانے کے لئے جلدی سے باہر نکل گئے ۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور مینا کے پاس آبیٹھی ۔میرے دل نے شدت سے چاہا۔'' کاش آج شعری آجائے ۔''
میں نے آنکھیں بند کر کے کئی بار اسے پکارا۔پھر میری برداشت جواب دے گئی میں نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور رونے لگی ۔مجھ پر لرزہ طاری تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ۔ مینا گم صم سی بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی ۔ میں نے روتے روتے مینا سے کہا۔
''تم بھی میرے لئے Pray نہیں کرتی ،تم کیسی دوست ہو......؟ میرا دُکھ بھی نہیں سمجھتی ۔''
ہر جاندار سننے ، دیکھنے کے ساتھ ساتھ محسوس کرنے کی حِس رکھتا ہے ۔اس کا اظہار بھی کرتا ہے ۔ مینا نے مجھے روتے دیکھا تو اپنی چونچ پنجرے کی سلاخ پر رکھ کر ٹک ٹک کرنے لگی ۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کی چونچ کو چھوا۔تو وہ اپنا سر میرے انگلی پر پھیرنے لگی ۔ جیسے مجھے دلاسا دے رہی ہو۔
رونے سے میرا من شانت ہو گیا۔ میں نے منہ دھویا پانی پیا اور ایک کپ چائے بنانے کے لئے چولہے پر پانی چڑھایا۔شعری کو

چائے پسند تھی مگر بہت ہلکے Strong میں اکثر کہتی۔

''آپ تو صرف پتی ہی پانی میں اُبال کر پی لیا کریں۔''

وہ ہنس دیتا۔ ہنستے ہوئے اس کے سامنے کے دانت چمک جاتے جو مجھے بہت اچھے لگتے۔

ایک دفعہ عروش نے کہا۔

''شعری بھائی! آپ کیوں ہمیں اچھے لگنے لگے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''بہت سمپل ہے یار۔ یہ تو خدا کی مرضی ہے، وہ جب چاہتا ہے ہمارے لئے کسی کے دل میں محبت پیدا کر دیتا ہے اور جس دل کو چاہے بدل سکتا ہے۔ سب کچھ اس کی رضا سے ہوتا ہے۔''

میری چائے نے خوشبو مہکائی تو مجھے یوں لگا جیسے شعری آیا ہو۔ شام کی چائے اکثر بن رہی ہوتی یا بن چکی ہوتی جب وہ آتا۔ چائے کی خوشبو نے اس کے آنے کا سماں باندھ دیا تھا۔

میں چائے کا کپ لے کر رسوئی میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چائے کی اٹھتی بھاپ میں بھی مجھے شعری ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میں گھونٹ گھونٹ چائے اپنے اندر اتارتی ایک بار پھر کھو سی گئی۔

''ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس دن اچانک ہی موسم خوشگوار ہو گیا۔ عروش نے Books بند کیں اور صحن میں کھیلنے لگا۔ مما حلوہ بنا رہی تھیں، سوجی اور الائچی کی ملی جلی خوشبو سارے گھر میں پھیل گئی۔ مما نے پلیٹ میں حلوہ نکالا اور مجھے کہا کہ شعری کے لئے لے جاؤ اس نے ذرا سا چکھا، میں پلیٹ اٹھا کر رسوئی میں رکھنے کے لئے اٹھی تو میرا پاؤں ٹھوکر کھا گیا۔ گرم گرم حلوہ شعری پر گرا کچھ میرے ہاتھ پر میں بوکھلا گئی۔ گرنے لگی تو شعری نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔ میں پاؤں کا درد بھول گئی۔ وقت تھم گیا۔ چونکے تو اس وقت جب بارش کے چھینٹے ہوا کے ساتھ اڑتے ہم پر آن گرے، میں شرمندہ سی پلیٹ لئے ''Sorry'' کہتی رسوئی میں بھاگی۔ پھر میں وہاں سے نکلی ہی نہیں حتیٰ کہ وہ واپس چلا گیا۔''

اتفاقات اور حادثات انسان سے جڑے ہیں...... محبت اور نفرت کسی نہ کسی اتفاق اور حادثہ کے باعث جنم لیتی ہے...... کبھی کوئی واقعہ وقت کی ٹہنی پر اُگ آتا ہے۔ جس سے محبت یا نفرت کے پھول کھلتے ہیں۔ یادوں کی پتیاں، کونپل پھوٹتے ہیں ہر گزرتا لمحہ جذبہ کو گود میں لے کر پروان چڑھاتا ہے...... اور ادراک کا مرحلہ آتا ہے۔ پھر اتفاق اور حادثہ کے پرندے اڑ کر کسی اور درخت پر جا بیٹھتے ہیں...... یوں محبت ہر لمحہ اپنا سفر طے کرتی ہے۔ یہ مرحلہ وہی جان پاتے ہیں جو اس جذبہ میں مبتلا ہو کر خداوند کی مرضی جان جاتے ہیں۔ کائنات کی حقیقت پا لیتے ہیں۔''

مینا کی چوں چوں مجھے واپس یادوں کے گھنے جنگل سے کھینچ لائی۔ شاید مجھے پاس نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔

ایک خوبصورت سرسبز و شاداب وادی ہے، ایک ندی جو درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ بہہ رہی ہے۔ پرندے رنگ برنگی بولیاں بول رہے ہیں۔ ہر پرندہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ کہیں دور سے جھرنوں اور آبشاروں کا ترنم بھی سنائی دے رہا ہے۔ فضا مختلف پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے۔ تتلیاں اڑتی پھرتی رس چوس رہی ہیں۔ ایک ہرن درختوں کے جھنڈ سے نکلا، ندی سے پانی پیا اور چوکڑیاں بھرتا پھر جھنڈ میں گم ہو گیا۔

اچانک ایک چرواہے کے روپ میں سفید لبادہ پہنے، چھڑی ہاتھ میں لئے نظر آیا۔ وہ ندی کے کنارے بیٹھ گیا۔ سفید روئی جیسی شفاف بھیڑیں اِدھر اُدھر چرنے لگیں، چرواہے نے چھڑی رکھ کر بانسری بجانی شروع کی۔ بانسری کی لے اور تان پُرسوز تھی۔ جیسے ہی

اس نے بانسری بجائی پھول کھلنے لگے، شگوفے پھوٹنے لگے۔ سامنے پہاڑوں سے ایک جھرنا پھوٹ پڑا۔ اس کا میٹھا پانی، چھینٹے اڑاتا جہاں جہاں گرتا۔ تتلیاں اُڑتی اور کلیاں چٹکنے لگیں۔ ایک انوکھی خوشبو کا جھونکا آیا۔ یکا یک ندی کا پانی دُودھیا ہوگیا۔ پھولوں اور پتوں کا گہرے تیز اور ہلکے رنگوں کا امتزاج ماحول کو خواب ناک بنا رہا تھا۔ میں ایک شیشے کے باؤل میں مٹھائی لئے کھڑی ہوں، میں اس چرواہے کی طرف بڑھتی ہوں۔ جیسے ہی میں اس کے سامنے جاتی ہوں میں خوشی سے رو پڑتی ہوں۔ وہ شعری تھا میں بے تابی سے پوچھتی ہوں۔

''تم کہاں چلے گئے تھے......؟''

اس سے پہلے کہ میں اس کا جواب سنتی۔ میری آنکھ کھل گئی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھی۔ میں جانے کب کی سوئی ہوئی تھی۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ میں گھر کی صفائی سے فارغ ہوکر کھانا بنا کر نہائی تو کمر سیدھی کرنے کو ذرا دیر کے لئے لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند......اتنا خوبصورت خواب، شعری کو میں نے پہلی بار خواب میں دیکھا تھا۔

مجھے اب یقین ہوگیا تھا کہ شعری جہاں کہیں بھی ہے خیریت سے ہے۔

میں یونیورسٹی سے گھر اور گھر سے یونیورسٹی جاتی۔ مما، ڈیڈی کے ملنے والے کہتے عیشل گم صم سی ہوگئی ہے۔ مما کی سہیلی جسے ہم موسو بولتے تھے۔ وہ جب بھی ملتی کہتی۔

''عیشل بہت خوبصورت ہوگئی ہے۔''

مما تفاخر سے مسکرا دیتی۔

اس اتوار موسم بہت خوبصورت تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا سبک روی سے چل رہی تھی۔ میری مینا بھی اچھل اچھل کر چوں چوں کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر آ کر کمروں میں آتی جاتی رہی، تھک گئی تو میرے پاس آ بیٹھی۔ میں نے چائے پی کر اسے پھر سے پنجرے میں بند کر دیا۔ اس اتوار بھی بہت خوبصورت دن تھا۔ جب شعری ملا تھا چند لمحوں کی ملاقات ساری زندگی پر حاوی ہوگئی تھی۔

میں نے رات کو سونے سے پہلے شعری کے لئے دعا مانگی۔ آنکھیں بند کر کے دیر تک اللہ سے باتیں کرتی رہی۔

''اے اللہ! تُو تو جانتا ہے شعری کہاں ہے......؟ تُو اس کی حفاظت فرما دے، اسے لوٹا دے۔ وہ اچانک سے آجائے جیسے اچانک ملا تھا......میری طرح وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہو......'' یاد کرتا ہو، میں Pray کرتے سوگئی۔

چاندی جیسے پانی کی ندی میں مجھے اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔ پھر ندی کا پانی آئینہ بن گیا۔ میں اس آئینہ میں اُتر گئی۔ میں نے دیکھا چمکتی دھوپ ہے۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ کسی نے تصویر بنائی کلک (Click) کی آواز آئی۔ ایک کلک میرے دل میں ہوئی۔ وہ لمحہ میرے دل میں اترتا بہت گہرائیوں میں چلا گیا۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ دھوپ اس کے چہرے پر روحانیت کی چمک سے اُجالا کر رہی تھی۔ مسکراتی آنکھوں اور گھنی مونچھوں تلے اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ کچھ کہہ رہے تھے مگر مجھے صرف ایک ہی آواز سنائی دی...... وہ پریم گیت کی صدا تھی۔ سامنے دو پہلوان اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہم پر محبت کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ شگوفہ سے پھول کھل رہا تھا، خوشبو رقص کرتی ہوئی دلوں کو نئی لَے اور تال پر ہاتھوں میں ہاتھ لے کر آنکھوں میں اترتے خمار میں رقص کرنے پر اُکسا رہی تھی۔ Outter کچھ اور تھے۔ مگر Inner محبت میں بھیگ بھیگ کر شانت ہو رہے تھے...... بے معنی باتیں کر کے

مسکرا رہے تھے۔

مقابلہ ختم ہو چکا تھا۔ لافانی جذبہ میں بندھے ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہوا کون جیتا......کون ہارا؟ وہ لمحہ کتنا Powerful تھا۔ اس کا اندازہ تو مجھے آج ہوا۔ وقت اس دوپہر پر حاوی نہ ہو سکا۔

شعری نے کہا۔

''سنو اچھی لڑکی! تم کل شام مجھے بہت یاد آئی......؟''

''میں نے کہا۔

''اچھا...... بتایا کیوں نہ......؟'' پھر شعری کی نظروں سے میری نظریں جو ملیں تو وقت کی قید سے پرے...... بہت پرے......ہم کھڑے تھے۔ میں نے پھر خواب دیکھا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا...... جیسے باہر نکل بھاگے گا۔ محبت کا نشہ وجود کے اندر سرایت کر رہا تھا۔ پھر میں کبھی شعری کی سحر زدہ آنکھوں کے سحر سے آزاد نہ ہو سکی......ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔

میرے ایم اے کے فائنل ایگزام سٹارٹ ہو گئے تھے۔ میں نے شعری کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے بہت محنت کی۔

وہ کہتا تھا......

''عیشل اگر تم نے 1st-Dev لی تو تم جو مانگو گی ملے گا۔''

عروش نے کئی بار کہا۔

''ڈیڈی ابھی سوچ لو کیا مانگنا ہے......؟''

میں فیصلہ نہ کر پائی کیا لوں گی اس سے۔

جب سے میرے ایگزام شروع ہو گئے تھے مما اور ڈیڈی دونوں آہستہ آہستہ کسی موضوع پر متفکر باتیں کرتے۔ آخری پیپر دے کر آئی۔ کئی راتوں کی نیند پوری کرنے کو میں سوئی تو شام کو ڈیڈی کی آواز سے ہی میری آنکھ کھلی۔ وہ مما سے کہہ رہے تھے۔

''انیتا ہم کب تک شعری کا انتظار کریں گے، میں نے اس کے سب دوستوں سے پوچھا......آفس سے بھی معلوم کیا سب لاعلم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک دن صبح صبح اپنے آبائی گھر جانے کے لئے نکلا تھا۔ دوبارہ واپس نہیں آیا۔ کوئی نمبر، پتہ بھی نہیں چھوڑا۔''

یہ کہتے ہوئے ڈیڈی کی آواز بوجھل ہو گئی۔

شاید وہ بھی شعری کو میرے لئے پسند کرتے تھے۔

ماں باپ کا رشتہ بھی کیسا بے لوث رشتہ ہے۔ بنا کہے، اولاد کے دل کو جان جاتے ہیں۔ ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔

میری نیند اُڑ چکی تھی۔ شعری کا نام میرے دل کی بے چینی کا نام تھا۔ پھر شام تک مجھے سکون نہ ملا۔ میرے دل کو پتنگے لگ گئے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

''عیشل! میں اور تیرے ڈیڈی سٹور سے راشن خریدنے جا رہے ہیں گھر کا دھیان رکھنا۔ میری جان! اب سونا مت، اٹھ کر بریانی بنانے کی تیاری کر لو۔''

مما دروازے میں کھڑی مجھے ہدایات دے کر چلی گئیں۔

شعری کے خیالوں میں کھوئے کھوئے میں نے کب بریانی کا مسالہ تیار کر لیا پتہ بھی نہ چلا۔ میں مینا کے پاس آ بیٹھی۔ وہ مجھے دیکھ

کر پھدک پھدک کر جھولا جھولنے لگی۔

''مینا کیا تم اپنے دوست کو بھول گئی ہو......؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اسی طرح جھولتی رہی بے نیازسی، میری طرف دیکھا بھی نہیں۔

''تم بہت بُری ہوگئی ہو اب میری سنتی نہیں ہو...... میں تم سے ناراض ہوں۔'' میں غصہ ہو کر اٹھی اور مما کے کمرے میں چلی آئی۔ Book Rack میں رکھی کتابیں دیکھنے لگی میں نے ایک کتاب اٹھائی۔اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔اس کتاب کے صفحہ نمبر 99 پر لکھا تھا۔

''دنیا کی طلب دل سے نکال دو تو من کو شانتی مل جاتی ہے۔ورنہ انسان جتنا طلب کے پیچھے بھاگتا ہے۔طلب اسے اتنا ہی بھگاتی ہے۔دل کی کھیتی میں ایک کے بعد ایک اور طلب اُگتی رہتی ہے۔طلب کی چاہت ختم کر دو، کچل ڈالو تو طلب خود بخود جھولی میں آ گرتی ہے۔''

میں نے کچھ اور صفحات پلٹے تو صفحہ نمبر 114 پر لکھا تھا۔

''کسی بھی مذہب میں زبردستی جائز نہیں۔زبردستی تو کسی کو محبت یا نفرت کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، ارادہ اور نیت دل سے ہوتے ہیں۔اور ہر عمل کی بنیاد کے لئے دل کی صفائی ضروری ہے۔دل کا آئینہ صاف ہو، طلب کی چاہ نہ ہو تو ایسا دل خالق کو پیارا ہوتا ہے۔''

کیا میں شعری کی محبت پانے کے لئے زبردستی تو نہیں کر رہی۔وہ پتہ نہیں میرا ہونا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔میں کیوں اس کی محبت پانے کے لئے اندھا دھند بھاگ رہی ہوں۔اس کے دل کی ڈور تو خود اس کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے۔

''تو کیا پہلے مجھے اسے راضی نہیں کرنا چاہیے جو دلوں پر قابض ہے؟'' اس سوال نے تو مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔مجھے یہ کتاب بہت دلچسپ لگی۔میں نے یہ کتاب شروع سے پڑھنے کا ارادہ کیا۔کتاب کا نام تھا ''راستہ محبت کا'' یہ کتاب میں نے پڑھنی شروع کی تو محبت کے راستوں پر ہونے والی انہونیوں کا ادراک ہونے لگا۔

اس کتاب میں ایک سچے واقعہ کا تذکرہ تھا۔یہ ایک لڑکی اور لڑکے کی محبت کا واقعہ تھا۔لڑکے کا نام ایان تھا۔اسے ایک محفل میں ملجا نامی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ایان نے اپنے والدین کو رشتہ کا پیغام دے کر بھیجا۔لڑکی والوں نے برادری ایک نہ ہونے پر انکار کر دیا۔اب نا امیدی اور مایوسی دلوں میں گھر کرنے لگی۔ایان نے ایک دن نماز پڑھنے کے بعد دعا کی یا اللہ! میرے دل میں محبت پیدا کرنے والا تُو ہے۔اب اس محبت کو پانے کے راستے کھول دے۔اسی دن شام کو اس کی ملجا سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔میرے ماموں سعودیہ میں ہوتے ہیں ان کے کہنے پر میرے والدین راضی ہو سکتے ہیں۔

اب ایان نے سعودیہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔اللہ کی مدد سے مکہ مکرمہ جا پہنچا۔ایان کا کہنا تھا کہ میں خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھا روتا رہا۔اللہ سے مدد طلب کرتا رہا۔اے میرے اللہ! میں تیری سرزمین پہ تنہا ہوں۔تُو مجھے سہارا دے۔

ایان آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی کام کرنا چاہتے ہو......؟''

''ایان نے فوراً ہامی بھر لی یوں ایان مکہ مکرمہ میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے لگا۔اس کی محنت اور ایمانداری دیکھتے ہوئے مالک بہت خوش تھا۔اس دوران ایان اور ملجا کا کوئی رابطہ نہ تھا۔سال میں ایک بار بات ہوتی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کے حالات سے باخبر تھے

۔ذریعہ، خواب اور خیال تھا۔ ایان کا کہنا تھا ہم نے محبت میں والدین کا احترام قائم رکھا۔ اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے رکھا۔ نیت صاف لگن سچی تھی۔ قدرت نے ساتھ دیا اور 9 سال بعد دونوں رشتہ ازدواج میں بندھے تھے۔'' میں یہ واقعہ پڑھ کر بہت روئی کہ میں کتنی کمزور ہوں۔ مجھے بھی خود کو باہمت بنانا ہے۔ دل میں اللہ کی ڈالی محبت کو خاموشی سے نبھانا ہے۔ وہ ضرور مجھے اس محبت کے ذریعے کچھ سکھانا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ مجھے شعری کی آنکھوں میں جو محبت دکھائی دی تھی اس پر بھروسہ کرنا ہوگا۔

میں خود سے وعدہ کر رہی تھی۔ حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میرے اندر ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ شعری کی یاد میرے دل کو جلاتی مگر میں نے اب خدا کا سہارا تھام لیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اللہ سے شعری کو مانگنے لگی۔

دعا کے بعد میرا دل مطمئن اور پرسکون ہو جاتا۔ انہی دنوں میرے رشتے آنے لگے۔ ایک رشتہ جو ہر لحاظ سے بہتر تھا، مما اور ڈیڈی کا اس کے لئے اصرار بڑھنے لگا، میں خاموش تھی۔ مما بولیں۔

''عیشل! تم شعری کا کتنا انتظار کرو گی۔ اس نے آج تک رابطہ نہیں کیا۔ تم کب تک اس کی راہ دیکھو گی......؟''

مما اس دن مجھے بے بس لگیں۔ حیرت بھی ہوئی کہ میں نے تو مما سے کبھی Share نہیں کیا۔ پھر وہ کیسے جان پائیں میری شعری سے جذباتی وابستگی کو۔ میری خاموشی دیکھ کر مما نے انکار کر دیا۔

ماں وہ رشتہ ہے جو اپنی اولاد کے دل میں جھانک لیتی ہے۔ سب جان لیتی ہے۔ جو بچہ ظاہر نہ بھی کرے وہ اپنی اولاد کے چہرے سے اس کی خوشی اور ناخوشی کے جذبات سب سمجھ کر بھی انجان بنی رہتی ہے۔

ستمبر کے آخری دن تھے گرمی کا زور کم ہو گیا تھا۔ اب رات کو ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا جسم میں کپکپی طاری کر دیتی۔ موسم بدل گیا...... میرے اندر کا موسم جوں کا توں تھا...... پھر ہونی نے اپنا آپ دکھایا۔ ڈیڈی کے کوئی ملنے والے ایک رشتہ کا پیام لے کر آئے جو مما، ڈیڈی کی نظر میں ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ سوہامی بھر لی گئی، میری حالت دریا میں ڈگمگاتی کشتی جیسی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی میری انگلی میں پہنائی گئی...... کب کیا ہوا...... مجھے کچھ نہیں پتہ...... میں بت بنی بیٹھی تھی۔ سارا جسم بے جان لگ رہا تھا۔ بچوں کی آوازیں قہقہے، عورتوں کی گھریلو باتیں، مردوں کی سیاست پر باتیں، سب ملی جلی آوازیں...... میرا سر چکرا رہا تھا۔ میری آتی جاتی سانسیں صرف اور صرف شعری کو پکار رہی تھی۔

سب مہمان جا چکے تھے میں اپنے کمرے میں آ کر بالوں میں پروئی کلیاں اتارنے لگی میں مسلسل شعری کو سوچے جا رہی تھی۔ کلیاں بالوں میں بری طرح الجھی ہوئی تھی بالکل ایسے ہی جیسے میری زندگی الجھے جا رہی تھی۔ میں نے انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں شدید خواہش نے جنم لیا...... کاش یہ انگوٹھی میں نے شعری کے نام کی پہنی ہوتی تو میرے جذبات واحساسات ہی اور ہوتے۔ شاید میں یہ خوشی برداشت نہ کر پاتی......اور مر جاتی۔

پتہ نہیں میرے نصیب میں کیا لکھا تھا...... میں سوچتی کیا میں اب کبھی شعری سے مل نہ پاؤں گی......؟

آخر میرے ساتھ ہی کیوں ایسا ہوا......؟

میں نے کبھی کسی کا دل نہ دُکھایا تھا...... پھر اللہ کو مجھ پر کیوں رحم نہیں آتا......؟ میں مایوس ہو رہی تھی۔

منگنی کے بعد میں کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ مما میری طرف دیکھتی اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی۔

میں نے مینا سے باتیں کرنا چھوڑ دیا تھا...... میں خود سے بھی ناراض تھی...... اپنے سے وابستہ ہر رشتہ سے......کبھی خود پہ غصہ آتا......کبھی بے بسی سے رو پڑتی۔

ہونی ہو کر رہتی ہے۔خواہ کتنا ہی ٹال لو۔ ہزار جتن کر لو......وقت بے لگام گھوڑے کی طرح بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہی رہتا ہے......
کبھی نہیں رُکتا......

میں ہر روز خود سے کہتی۔
''اب کبھی شعری کو یاد نہیں کرنا۔''
ہر روز ہی یہ وعدہ میرے کمزور ارادہ کی بھینٹ چڑھ جاتا۔
میں خود سے ہر روز یہی کہتی ہوں
کل اسے بھول جانا ہے
خود سے لڑتی ہوں......روتی ہوں
پھر میں اسے
''بھولنا'' بھول جاتی ہوں۔

جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔شعری شدت سے یاد آتا۔ میں چھپ چھپ کر روتی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے اپنے منگیتر کا خیال نہ آتا میں کوشش کرتی۔ میرے دل میں اس کا خیال جاگزیں ہو......مگر شعری میرے دل ودماغ سے نہ نکلتا۔

مما نے اپنی کولیگ رمشا آنٹی کے ساتھ جا کر کیا کیا خریدا...... مجھے کچھ نہیں پتا۔

جب بھی شادی کا ذکر ہوتا میری دھڑکن رکنے لگتی۔ مجھے لگ رہا تھا میں جلد ہی مر جاؤں گی......مما اور ڈیڈی کو دیکھ کر میں کوشش کرتی......خوش خوش نظر آؤں......مگر میں خوش ہونے کی کوشش میں رو پڑتی۔

جس جگہ میں بیٹھ کر شعری سے پڑھتی تھی وہاں دیکھتی رہتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی وہ آ جائے گا۔ سب کچھ ویسا ہی ہو جائے گا۔شام کی چائے،عروش کی باتیں،مما کی چائے کی خوشبو......میرا اچانک شعری کو دیکھنا......اسے دیکھتا پا کر گڑبڑا جانا......مگر گیا وقت لوٹا ہی نہ کبھی......میری دلی تمنا......حسرت بن کر رہ گئی۔

میں کھوئی سی چپ چاپ سوچے گئی۔

مینا پنجرے میں پھدک پھدک کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اداسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

''عیشل! اب رویا نہ کرو۔ اگلے گھر جانے کا وقت قریب ہے۔ بہت قریب......خود کو سمجھاؤ تمہیں اپنی مما، ڈیڈی کی خاطر بدلنا ہوگا۔''

اس رات میں سونے سے پہلے خود سے یہ عہد کر کے سوئی کہ اب کبھی شعری کو یاد نہیں کرنا۔اس کی یاد کو دل کی گہرائیوں میں چھپا کر دفن کر دوں گی۔خدا سے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ مجھے ثابت قدم رکھنا۔آنسو میری آنکھوں سے اُمڈ آئے۔

آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ بارش ہونے کو تھی ہر طرف دھند ہی دھند تھی۔ دھواں ہی دھواں...... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ میرا دوپٹہ گیلا ہو گیا تھا۔ جیسے بارش برسی ہو۔اچانک سامنے روشنی ہوئی۔ دھندلا سا سایہ دکھائی دیتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھ نہ پا رہی تھی۔ بہت کوشش کرتی ہوں۔اسے پہچاننے کی۔اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں لمس پہچان جاتی ہوں۔ وہ شعری تھا اس نے مجھے باغ میں ایک بنچ پر بٹھا دیا۔ ہر طرف پھولوں کی خوشبو تھی۔ وہ خود میرے پیروں میں دوزانو بیٹھ گیا۔میرا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

منگنی کی انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہلکی سی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مجھے اس کا اس طرح نیچے بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے انگوٹھی کے بارے میں بھی کوئی استفسار نہ کیا۔ میں رونے لگی۔ مجھ سے بات نہ ہو رہی تھی۔

''عیشل! پلیز اپنا خیال رکھا کرو۔ خوش خوش رہا کرو۔ تم جس سفر پر گامزن ہونے والی ہو۔ بہت مشکل ہے مگر میں تم سے بھی زیادہ کٹھن سفر کا مسافر ہوں...... پاگلوں کی طرح جاگتی نہ رہا کرو۔ تم بہت اچھی ہو......''

وہ ٹھہر ٹھہر کر آنسو پیتا ہوا بولا۔

میں شعری سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔

کیا میری یاد کبھی نہیں آئی......؟ کسی لمحہ، پل تو مجھے سوچا ہوگا......؟ کیا تمہیں کچھ یاد نہیں......؟ میرے دل کی سب دل میں رہ گئیں۔ اس نے میرا ہاتھ دھیرے سے چھوڑا اور اٹھ کر چل دیا...... میں دیوانہ وار بھاگی...... میرا دل چاہا میں اس کے پاؤں سے لپٹ جاؤں......اسے جانے نہ دوں۔

دل حسرتوں کی آگ میں جل اٹھا

''زندگی''

اک زندگی ہوتی

تم ہوتے اور میں ہوتی

محبت میں جانے کیا کیا کرتی

تم کہتے ''مر جاؤ''

میں مر کے بھی دکھا دیتی

رات کا تیسرا پہر تھا۔ میں سسکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ بھی خواب تھا۔ کاش یہ خواب نہ ہوتا میں اسے روک پاتی۔

بہت سارے دن تیزی سے گزر گئے۔ گھر میں غیر معمولی چہل پہل سے مجھے اندازہ ہوا آج میری مہندی ہے۔

کاش اے کاش...... یہ دن نہ آتا...... میں مر جاتی......سب مسکراتے چہروں سے آ جا رہے تھے۔

لڑکیوں نے میرے دونوں ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ جب وہ میری ہتھیلی پر ثامر کا نام لکھنے لگیں تو میں نے ہاتھ کھینچ لئے۔ انہوں نے اسے میری شرم جانا۔ کاش میرا اب آئندہ زندگی میں بھی ایسے ہی بھرم رہ جائے۔

وہ دن بھی آ گیا جب میرے نام سے ثامر کا نام جوڑ دیا گیا...... کاش دلوں کو جوڑنا بھی انسان کے بس میں ہوتا۔ میں بہت روئی...... میں خدا سے ناراض ہوگئی......صرف ایک ہی دُعا بار بار مانگی تھی۔ وہ بھی قبول نہ ہوئی۔

میں ایسے ہی ناراض، ناراض اداس پارلر سے تیار ہو کر سیدھی مینا کے پاس گئی۔

''مینا! شعری سے کہنا...... میں نے بہت انتظار کیا...... بہت روئی......سنو! اس سے کہنا میں زندگی کی آخری سانس تک انتظار کر سکتی تھی......مگر میں بنتِ حوا ہوں نا...... میں کیسے اس کے نام کے سہارے زندگی گزار دیتی۔ مجھے رشتوں کا بھرم رکھنا ہے...... مجھے ڈیڈی کا سر فخر سے بلند رکھنا ہے......اور......ممی کو بھی دُکھی نہیں کر سکتی۔ اب صرف میرا دل ٹوٹا ہے......کوئی بات نہیں مینا!......

میں سسک پڑی۔ میں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے یوں رو رہی تھی۔ بس زیست یہی تک تھی۔

عروش نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''دیدی اب بس کرو......بس چپ......دیدی......'' وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔میری پیشانی پر بوسہ دے کر پھولوں سے سجی گاڑی تک یوں لایا جیسے میں کانچ کی گڑیا ہوں......میں ثامر کے بیڈ روم میں تھی۔میں مردہ سی بیٹھی تھی جیسے ابھی روح میرے جسم سے پرواز کر جائے گی۔

مجھے دلہن بنا سجا سنورا دیکھ کر ہر ایک نے تعریف کی،سراہا۔عروش کئی بار کہہ چکا تھا۔

''دیدی تم ایک دیوی جیسی دِکھتی ہو۔''

میں سوچنے لگی۔

''دیوی کی یا تو قربانی دی جاتی ہے یا پیش کی جاتی ہے۔''

رات بہت سرد تھی۔جنوری کی یخ بستہ راتیں تو ویسے بھی سناٹوں کے ساتھ چلتی ہیں۔جانے رات کا کون سا پہر تھا۔میں بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے بھاری بھرکم دوپٹہ سر پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ثامر نے میرے ہاتھ کو چھوا......میں دائیں طرف لڑھک گئی یوں لگا میری روح پرواز کر گئی......میں بے ہوش چکی تھی۔

ثامر نے مجھے بخار میں جلتے دیکھا تو اپنی اماں جی کو بلا لایا۔فیملی ڈاکٹر آیا۔انجکشن......دوا،سیرپ جو بھی بہتر سمجھا علاج کیا۔

جب میری آنکھ کھلی میں اسی طرح بنی سنوری سوئی پڑی تھی،دائیں طرف ثامر کو گہری نیند میں دیکھا۔میں اٹھ بیٹھی مجھے اپنے سارے جسم میں درد کی لہریں اٹھتی محسوس ہوئیں۔میرا گلا خشک تھا۔میں نے اٹھ کر پانی کا گلاس بھرا اور بیڈ پہ آ بیٹھی۔میں پاؤں لٹکائے پانی پی رہی تھی۔سامنے آئینہ میں اپنا روپ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

میں اتنی خوبصورت ہوں......یا ڈریس اور میک اپ کا کمال ہے۔میری دودھ جیسی رنگت میرے سرخ اور گہرے سبز رنگ کے ڈریس میں چمک رہی تھی۔لمبے گھنے سیاہ بال بکھرے بکھرے میرے شانوں پر لہرا رہے تھے۔بندیا میری پیشانی سے پھسل کر بالوں میں اٹک گئی تھی۔میں اپنا یہ حسین روپ دیکھ کر روتی جا رہی تھی۔میں رو بھی رہی تھی ڈر بھی رہی تھی۔کہیں ثامر جاگ نہ جائیں۔ثامر نے کروٹ لی تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آنے کو تھا۔پتہ نہیں میں کیوں چاہتی تھی وہ سویا رہے۔

میں نے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا اور ڈریسنگ روم جو بیڈ روم سے ملحق تھا جا کر Change کیا۔منہ ہاتھ دھوئے لائٹ سے کلر کا ایک ڈریس نکال کر پہن لیا۔مجھے پھر شعری یاد آنے لگا۔میرا خود سے کیا عہد ٹوٹنے لگا......

ایک دن میں اپنی اسائنمنٹ بنا رہی تھی۔عروش مجھے تنگ کر رہا تھا۔مجھے غصہ آ گیا میں نے پاس پڑا ہیئر برش اٹھا کر اس کی طرف مارا۔اُسے اُلو،گدھا نہ جانے کیا کچھ کہنے لگی۔مجھے پتہ ہی نہ چلا کب شعری آ گیا۔

مجھے غصہ میں دیکھ کر بولا۔

''عیشل!اتنا غصہ نہ کیا کرو تم غصہ کرتی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔'' آنسو میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔مجھے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔میں بیڈ کے ایک کونے پر ٹک گئی۔میں نے اپنے اور ثامر کے درمیان تکیہ رکھ دیا۔اور کمبل کا ایک کونہ اپنے پاؤں پر رکھا۔تاکہ پاؤں گرم رہیں۔سونے کی کوشش کرنے لگی۔کچھ نہیں پتہ کب آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھی تو ثامر اٹھ کر کمرے سے باہر جا چکے تھے۔کمبل میرے اوپر اوڑھا گئے تھے۔

ثامر جتنے نرم مزاج تھے اماں جی اتنی ہی سخت مزاج۔رات 9 بجے ''بندھن'' میرج ہال میں ڈنر تھا۔پارلر سے تیار ہو کر میں سیدھی ہال پہنچی،وائٹ اور گولڈن براؤن کلر سکیم سے تیار کردہ ڈریس میں ہر کسی نے مجھے سراہا۔میں زبردستی مسکرا بھی نہ سکی۔مما کو جب پتہ چلا

کہ میں رات بھر بے ہوش رہی ہوں تو فکرمندی سے مجھے دیکھنے لگیں۔صرف اتنا کہہ پائیں۔

''عیشل!ہماری عزت کا خیال رکھنا۔''

میں نے پھر صرف ان کی عزت کا خیال رکھا۔اپنا آپ بھی بھول گئی۔بھولی نہ تو شعری کو۔جو میری رگ رگ میں اُتر چکا تھا۔سات سال میں، میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔اگرچہ میں نے ثامر کا بہت خیال رکھا۔محبت کرنے اور نبھانے کی بھی کوشش کی مگر وہ کہتا تھا۔

''عیشل تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔یوں لگتا ہے زبردستی اس رشتہ کو نبھا رہی ہو۔''

میں ہنس کر ٹال دیتی یہ مجھے بھی پتہ تھا کہ ثامر شعری کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔حالانکہ وہ میرے بچوں کا باپ تھا۔ثامر بہت اچھا شوہر تھا بس ذرا موڈی تھا......مرضی ہوتی تو محبت کرتا......Care کرتا......موڈ نہ ہوتا تو کئی کئی دن نہ پوچھتا تھا۔پروا نہ کرتا۔

میں اندر ہی اندر مر جاتی۔شاید میں بیوی کا کردار اچھا نبھا نہ رہی تھی۔

میں نے اپنی ذات کی نفی کر کے خود کو میاں اور بچوں تک محدود کر لیا تھا۔جب کبھی میں مما کی طرف جاتی پارک کو جانے والی سڑک پر میں بار بار مڑ کر اس جگہ کو دیکھتی جہاں میرا جوتا ٹوٹ گیا تھا۔اسی دن عیشل کا اپنے آپ سے ناتا ٹوٹ گیا تھا......میرا دل میرا نہ رہا......مجھے اپنی سوچ، خیال پر کوئی اختیار نہ رہا۔

میرے دل کی بے کلی ہر وقت مجھے بے چین رکھتی۔بہت کم مما کی طرف جاتی۔مجھے وہاں جا کر شعری بہت شدت سے یاد آتا تھا۔میں جان گئی تھی۔دنیا سے جانے والوں کو ہم آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں، صبر کر لیتے ہیں مگر......جو زندہ ہو اور چھوڑ جائے انہیں بھولنا کتنا مشکل ہوتا ہے کتنا صبر آزما ہوتا۔

اب مجھے ثامر کی بے اعتنائی کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔میں ہزار ہا کوشش کے باوجود بھی اس کے موڈی پن کو ختم نہ کر پائی تھی۔مجھے بھی اذیت برداشت کرنا آ گیا تھا۔

میرے بچے یعنی بیٹا بیٹی دونوں بہت سمجھدار ہیں۔میں سوئی ہوتی ہوں تو میرا بیٹا پاس بیٹھ کر مجھے تکتا رہتا......میری آنکھ کھلتی تو میں پوچھتی۔''ایسے کیوں بیٹھے ہو......؟ کیا دیکھ رہے ہو؟''

وہ کہتا۔''مما آپ کتنی خوبصورت ہیں۔''

بیٹی کہتی۔''آپ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔''

غرض اس طرح کی رائے دیتے رہتے کبھی جب موقع ملتا تو میرے پاؤں چوم لیتے۔

میں نے خود کو بچوں کے ساتھ مگن کر لیا تھا۔البتہ شعری کو کبھی نہ بھولی۔وہ میرے ذہن سے نہ نکلتا۔میں اس کی محبت میں خود کو بُرا بھلا کہتی اور اپنے اندر کے اس عیب کو، داغ کو چھپانے کے لئے میں گھر سے باہر اور گھر کے سب کام عمدہ طریقے سے انجام دیتی۔میں ثامر کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔میرا دل دکھ اور کرب سہہ کر کمزور ہو گیا تھا۔

اچانک بیٹھے بیٹھے ڈوب جاتا، میں ایک ماں اور بیوی کی تمام ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھا رہی تھی مگر شعری کی محبت میرے دل پر براجمان رہی۔میں اب کرب نارسائی کی عادی ہو گئی تھی۔یہ دکھ مجھے دیمک کی طرح کھا رہا تھا۔

عشق کا جذبہ تو الوہی جذبہ ہے۔جو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔پھر نئی زندگی دیتا ہے جو عام لوگوں کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔

انسان عشق میں ڈوب کر بہت سی غیر اخلاقی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔جیسے مجھے کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت پسند نہ رہی۔

مجھے کسی کے اندر برائی نظر نہ آتی، میں ہر ایک سے محبت سے پیش آتی۔ میں خدا کو راضی کرنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتی۔ کبھی کبھی یوں لگتا میں منافقت کر رہی ہوں......مگر میں نے تو کسی کا دل نہ دکھایا۔ ہر ایک کا اچھا سوچتی۔

میں کم گو تھی اب اور زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔ ایک دن میں اپنی بیٹی دعا کے ساتھ لائبریری گئی اسے کچھ کام تھا۔ میں بھی وقت گزاری کے لئے Books کے نام پڑھنے لگی۔ ایک سبز اور سرخ فلیپ والی کتاب نکالی۔

''محبت، عشق اور خدا'' میں یہ کتاب لے کر کرسی پر آ بیٹھی۔ دعا کتابوں کا ڈھیر لگائے لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ میں نے کتاب کے اوراق پلٹے، محبت کا مفہوم، عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک کا سفر تھا۔ اس کے ایک صفحہ پر تحریر تھا۔

''محبت خدا کی عطا ہے یہ ان دلوں میں جنم لیتی ہے جو دنیاوی الائشوں سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ معصوم دلوں میں اٹھنے والی اس پاکیزہ خوشبو کا نام ہے۔ جو صاف شفاف دلوں سے ہوتی ہوئی پاک دلوں میں اتر جاتی ہے۔ یہ خدا کے حکم سے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ دل کو شفاف آئینہ بنا دیتی ہے۔ پھر دل ایک ہی گیت گاتا ہے۔ محبت کا گیت......عشاق کے دلوں کو کبھی کسی پل چین نہیں ملتا۔ وہ بے چین و بے قرار رہتا ہے۔ یہ تو مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ یہ خدائی جذبہ دل میں اتر کر ایسی وحشت اور جنون طاری کر دیتا ہے۔ کہ عام لوگ عاشق کو سمجھ نہیں پاتے۔ ان کے چہرے پر اللہ کا نور ہالہ کیے رکھتا ہے۔ کہ دیکھنے والے نظر بھر دیکھ نہیں سکتے۔ عاشق اپنی دلی کیفیات کو اگر چھپا کر رکھتا ہے، اپنی بے قراری کو اپنے محبوب پر آشکار نہیں کرتا تو اس کے لئے دنیا میں ہی جنت کی بشارت ہوتی ہے۔ وہ خدا کا منظورِ نظر ہوتا ہے۔ چونکہ خالق خود بھی عاشق ہے۔ وہ اس خدائی جذبہ کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کرتا ہے جو خاص ہوتے ہیں۔ جو ہر امتحان کو پاس کر لیتے ہیں۔ صبر کرنے والے ہوتے ہیں۔

عاشق اور معشوق ایک لمحہ اور ایک پل میں مقید ہو جاتے ہیں جب وہ ہر کیفیت کو اپنے اندر اترنے دیتا ہے، لوگوں سے چھپا کر رکھتا ہے تو خدا کا محبوب بن جاتا ہے۔ اسے اور کیا چاہئے......کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ میں جوں جوں یہ کتاب پڑھتی گئی میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے میں نے یہ کتاب خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ دعا اپنی اسائنمنٹ تیار کر چکی تھی۔ وہ سوشیالوجی میں MSC کر رہی تھی۔ اکثر اپنے پاپا کے ساتھ لائبریری آتی تھی۔ آج وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

میرے دونوں بچے بہت فرمانبردار تھے۔ بہت حساس تھے اکثر کہتے ''مما ہم بڑے ہو کر ایک Charity Home بنائیں گے جہاں ضرورت منداور غریب بچوں کی مفت تعلیم کا بندوبست ہوگا۔ پریشان حال لوگوں کو وظائف دے کر انہیں چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے کے اہل بنائیں گے۔ دعا نے اسی مشن کو سامنے رکھا اور سوشیالوجی کا انتخاب کیا۔ میں اپنے بچوں کی طرف سے مطمئن تھی۔ ان کی سوچ اور ارادہ انہیں کبھی غلط راہ پر چلنے نہیں دیں گے۔ یہ میرے اوپر اللہ کی رحمت تھی۔ میرے بچے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو جاتے۔ وہ میری دلجوئی کرتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری نیند مجھ سے روٹھنے لگی......میں چند گھنٹے ہی سو پاتی۔ میں دائیں طرف کروٹ لے کر سوتی تو کھڑکی میں چاند عین میرے چہرہ کی طرف ہوتا۔ میں شعری کو یاد کرتے، روتے......جانے کب سو جاتی۔ کئی بار اٹھتی جیسے کوئی پکار رہا ہو...... یہ آواز شعری کی ہوتی، رات اپنا سفر طے کرتی۔ چاند اور رات ہمسفر ہوتے......پھر صبح اپنے آنے کا پیام دیتی۔

کتاب ''محبت، عشق اور خدا'' نے تو مجھے بدل کر رکھ دیا۔ اب میں جب بھی اداس ہوتی یہ کتاب نکال کر پڑھنے میں محو ہو جاتی۔ دعا نے میری پسندیدگی دیکھتے ہوئے کتاب خرید کر مجھے Mother Day پر گفٹ کر دی۔

سمیرا اکثر میری گود میں سر رکھ کر پوچھتا۔

''ممایار! آپ کیوں اتنی پیاری سی ہیں۔''
کبھی میرا دوپٹہ اپنے منہ پر ڈال کر لمبی سانس کھینچتا۔''اُف آپ کا دوپٹہ کتنا خوشبودار ہے۔''
میں ہنس دیتی۔
ان کی محبت کی بے ساختگی اور وارفتگی میرے دل کے جلے نہاں خانوں میں محبت کی بارش برساتے۔
مجھے یوں لگتا میں نے اپنا وجود شعری کی محبت میں جلا کر بھسم کر ڈالا اور خدا کے سوا کسی سے نہیں کہا......نہ روئی۔تنہا اس آگ میں جلتی رہی۔
اس محبت کا صلہ اب خدا نے مجھے دینا شروع کر دیا تھا۔دل کی بے چینی کی اب میں عادی ہوگئی تھی۔کسی کے عشق کے بغیر بھی جینا کوئی جینا ہوتا ہے...... میں خواب بہت کم دیکھتی۔مگر جو دیکھتی سچ ہوتے۔مجھے یوں لگتا میں جب بھی کبھی شعری سے ملوں گی......اس سے بچھڑی تو مر جاؤں گی...... ملنے کی کوئی راہ بھی نہ تھی۔
دسمبر کی آمد آمد تھی۔ٹھنڈی اداس شامیں دسمبر کی آمد کا پیام دے رہی تھیں۔مجھے ماہ دسمبر ہمیشہ ہی اداس کر دیتا تھا۔خاص کر شام کا سناٹا اندر رگوں میں اترتا چلا جاتا۔
میں بدلتے موسم کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔صبح سے رات تک میں نے ثامر اور بچوں کے گرم کپڑے نکال لئے۔یہ خاصا محنت طلب کام تھا۔میں بہت تھک گئی تھی۔شدت سے خواہش سر اٹھانے لگی۔
کاش شعری ہوتا، جی بھر کر اس سے باتیں کروں...... مجھے لگتا......میرا مردہ وجود جاگ اٹھے گا......زندگی خوبصورت ہوگی۔اگر وہ مجھ سے باتیں کرے مجھ سے بیتے وقت کا حال پوچھے گا۔اور میں اسے سب سناؤں تو پھر سے جی اٹھوں گی۔میں محبت سے عشق کا سفر طے کر کے خدا کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔کائنات کے اسرار و رموز بھی سمجھنے لگی تھی۔انہونی اور ہونی کو میں تو جان گئی تھی۔
سردی بڑھنے لگی تو میں کافی بنا کر ''محبت،عشق اور خدا'' لے کر بیٹھ گئی۔
''عاشقوں کی خوشی محبوب سے وابستہ ہو جاتی ہے۔یہ کتنے بااختیار ہو جاتے ہیں۔صرف عاشق ہی جان پاتے ہیں۔ہزاروں میل دور رہ کر بھی ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ایک کی بے چینی دوسرے کو بھی بے قرار رکھتی ہے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک محبت کرے اور دوسرا نفرت......
محبت ایسی مقناطیسی کشش رکھتی ہے کہ جلد یا بدیر عاشق کو اور محبوب کو ساتھ لا کھڑا کر دیتی ہے۔اس جذبہ سے خواہ کتنے ہی منکر رہو۔یہ جنون طاری کر کے ہی چھوڑتا ہے۔بھوک، پیاس،طلب اور خواہش سے لاتعلق کر دیتا ہے۔یہ نہ کھل کے رونے دیتا ہے نہ ہنسنے دیتا ہے۔جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔عشق کی خوشبو من میں بسائے عاشق بے دلی سے جیتا ہے اُسے موت سے ڈر نہیں لگتا۔''
میں یہ پڑھ کر چونک گئی کہ میں تو ایسے ہی جی رہی ہوں میں نے تو کبھی موت سے خوف نہیں کھایا۔نہ دنیا سے محبت ہوئی۔اب تو یہ دنیا اور اس سے جڑا ہر رشتہ، ہر فانی چیز بے وقعت لگتی ہے مجھے۔کیا میں شعری سے محبت کر کے ایسے ہی جی رہی تھی کہ جینے کا حق ہو جیسے۔

میرے دل میں طمانیت اتر آئی میں نے کافی بڑے بڑے گھونٹ لے کر ختم کی اور کتاب کو نئے سرے سے پڑھنے کا سوچا۔میں بچوں اور ثامر کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ برت رہی تھی مگر ہر وقت کی مصروفیت بھی مجھے شعری سے دور نہ کر پائی۔گھریلو ذمہ داریاں اپنا ہی کٹھن مزاج رکھتی ہیں۔یہ سب کر کے مجھے لگتا میں فارغ ہی ہوں۔میں بہت کم لوگوں سے ملنا پسند کرتی۔اور کئی کئی گھنٹے چپ چاپ

سی بیٹھی رہتی۔اور سوچتی میں کیسی ماں ہوں۔عشق میں مبتلا ماں۔عشق میں مری ہوئی بیوی، یہ میں کیسی زندگی گزار رہی ہوں اگر دوسروں کو علم ہو جائے تو میں سب کی نظروں سے کیسے گر جاؤں گی، پھر میں سوچتی یہ میرا دل ہے میری مرضی۔ میں کیوں کسی کی پرواکروں۔ میں نے کون سا خود چاہا تھا ایسا ہو جائے یہ تو خدا کے حکم سے ہوا ہے۔اب اس نے یہ جذبہ میرے دل میں اُتارا ہے تو مرتے دم تک نبھاؤں گی۔ میں اپنے سے جڑے تمام رشتوں کو بڑے اعتدال سے نبھار ہی تھی۔کبھی کسی کو شکایت یا گلہ کا موقع نہ دیا تھا۔شعری سے مجھے اپنا رشتہ سقراط اور ڈیلفی جیسا لگتا تھا۔جیسے سقراط ڈیلفی سے باتیں کرتا۔

ایک دن اپنی الماری کی صفائی کرتے ہوئے مجھے اپنی ڈائری مل گئی۔ مجھے یہ پا کر بہت ہی اچھا لگا۔ان دنوں شعری مجھے پڑھانے آتا۔ جب وہ چلا جاتا میں اس کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتی۔اس زمانے کی لکھی ہوئی نظم نے مجھے واپس لا کر پھر مما کے آنگن میں مینا کے پنجرے کے پاس لا بٹھایا۔

''تم میرے ہو''
آ کے میرا ہاتھ تھام لے
مجھے دور فلک کے اُس پار لے چل
میں بادلوں کے سنگ اُڑتی پھروں
تیرے پیار میں گیت گاتی پھروں
وقت کی قید سے پرے
نیلے گگن پہ اک چھوٹا سا
ستاروں کا گھر بنائیں
ہوا میرا آنچل بنے
''تم میرے ہو''
فرش سے عرش تلک یہ بات ٹھہرے

میں نے یہ نظم کئی بار پڑھی۔ بار بار پڑھی ہر بار مجھے نئی سی لگی۔شادی کے بعد مینا بھی ایک دن پنجرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر اڑ گئی۔ مما نے مجھے فون کر کے بتایا۔ مجھے ذرا بھی دُکھ نہ ہوا۔ میں نے سوچا اچھا ہوا وہ چلی گئی۔ وہ تو شاید میری اور شعری کی جدائی دیکھنے آتی تھی۔اس نے دیکھی اور چلی گئی۔

دُعا اور سمیر اب اپنی منزل کے بہت قریب تھے۔ ثامر اب ہر ایک کو بتاتے کہ یہ سب ان کی مما کی محنت ہے۔ میں تو ان کو صحیح طریقے سے وقت بھی نہ دے پاتا تھا۔ بچے شروع سے ہی میرے ساتھ Attach تھے۔دل کی ہر بات مجھ سے کرنے کے عادی تھے۔ میں محبت گزیدہ ماں تھی۔ بہت حساس تھی، ان کے دل کو ان کے کہے بغیر ہی جان جاتی۔ بہت ہی مشکل زندگی گزار کر میں اب تھکتی جا رہی تھی۔ میرے دل میں اکثر ہی ہلکا سا درد رہتا۔مگر میرے لئے یہ زیادہ تکلیف دہ بات نہ تھی۔ میں کرب سہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں تو بچوں نے مری جانے کا پروگرام بنایا۔ میں نے بہت منع کیا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہیں بھی جانے کو مگر ثامر نے بچوں کا ساتھ دیا۔ یوں ہم شام تک مری پہنچ گئے۔ ثامر کے دوست کی Hut تھی۔ہم نے وہیں قیام کرنا تھا۔ بہت خوبصورت جگہ تھی۔ ہر طرف دیودار کے درخت آسمان کو چھوتے دکھائی دیتے۔ درختوں میں چھپی ہوئی یہ Hut مجھے اتنی بھائی کہ دل نے بے اختیار چاہا کہ

ادھر ہی ساری زندگی بیت جائے۔ دعا نے سب چیزیں سیٹ کرنی شروع کر دیں۔ اس نے مجھے کچھ نہ کرنے دیا۔ وہ اب میرا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اداس سا موسم تھا۔ درختوں سے ہوا ٹکراتی تو اپنا مخصوص سا اثر چھوڑ جاتی۔ یوں لگتا جیسے کوئی پاس آ کھڑا ہوا ہو۔

جب کوئی پرندہ بولتا تو گویا کسی نے پکارا ہو۔ مجھے وہ دن یاد آ گئے جب شعری کو اپنی کمپنی کی طرف سے ایک ماہ کے لئے مری جانا تھا۔ میں اس کے مری جانے کا سن کر بہت اداس ہوئی تھی۔ اور چاہا تھا کہ میں بھی ہوا بن کر اس کے ساتھ ساتھ پھروں اور دیکھوں شعری مری میں چلتے پھرتے کیا محسوس کرتا ہے۔ مجھے بھی یاد کرتا ہے۔ میں سوچتی اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ وہ بھی مجھے یاد کرتا ہے تو شاید میں سانس لینا بھول جاتی یا میں خوشی سے مر جاتی۔ پھر جی نہ پاتی۔ محبت بھی کتنی عجیب سرفروشی رکھتی ہے کہ انسان دل سے جی نہیں پاتا۔ اس کی زندگی وہی لمحات ہوتے ہیں جو وصل کے میسر ہوتے ہیں۔ یہ لمحات بڑے نایاب ہوتے ہی۔ مجھے کھڑکی میں کھڑے کھڑے کئی بار محسوس ہوا کہ شعری نے مجھے پکارا ہے۔ بلایا ہے میں کئی بار چونکی۔ میرا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ شعری کی محبت کیوں میرے دل کی بند گلی میں اتری۔ اور میری رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ پھر میں سوچتی اگر مجھے کینسر ہو جاتا تو زندگی زیادہ مشکل ہو جاتی۔ میرے بچے ہر لمحے مجھے مرتا دیکھتے۔ اس سے تو محبت ہو جانا ٹھیک تھا۔ محبت بھی کینسر سے کم نہیں یہ اندر ہی اندر مارتی ہے۔ بیرونی طور پر کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ محبت نے دل کے اندر کیا شور برپا کر رکھا ہے۔ دعا نے کافی بنالی ایک کپ مجھے پکڑایا اور پھرتی سے بیڈ شیٹ درست کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ وہ میرے برعکس تھی بہت چست تھی البتہ میری طرح لانبے گھنے بال۔ کمر تک جھولتی چٹیا ہر وقت اس کی کمر پر رقصاں رہتی۔ ڈیڈی اکثر میرے لانبے کھلے بال بکھرے دیکھتے تو کہتے عیشل اپنے بال سمیٹو۔ اتنے لمبے بال دیکھ کر تو ڈر لگتا ہے کہ کوئی چڑیل ہمارے گھر گھس آئی ہے۔ میں ڈیڈی کو خفگی سے دیکھتی اور بالوں کو بے ترتیب سا باندھ لیتی۔ لوگ میرے لمبے بالوں کی تعریف کرتے مگر مجھے اب چڑ ہوگئی تھی۔ سکول کے اک فنکشن میں کھلے بال چھوڑے میں نے ایک کلاسیکل گیت پر رقص کیا تو لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ میں سکول تک کتنی شوخ وچنچل تھی۔ ٹک کر بیٹھنا تو میں نے سیکھا ہی نہ تھا اور چپ رہنا تو مجھے آتا نہ تھا۔ میرا منہ دُکھنے لگتا۔ اگر میں چپ رہتی۔ ڈیڈی کہتے عیشل اتنا نہ ہنسا کرو میں کہتی اچھا ڈیڈی اور پھر ہنستی چلی جاتی، کتنی بدل گئی تھی اور کب بدلی مجھے پتہ بھی نہ چلا۔

''مما کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے اب کھڑکی بند کر دیں۔ شام ہو رہی ہے، شال بھی نہیں لی آپ نے۔'' دُعا نے اندر آ کر کہا۔

میں چونک گئی کافی کا مگ لئے میں دعا کو بغور دیکھنے لگی۔

وہ بولی۔ ''مما ایسے کیا غور سے دیکھ رہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھ رہی ہوں میری بیٹی کتنی بڑی اور سمجھدار ہوگئی ہے۔''

میں اکثر بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر پوچھتی رہتی کہ میں نے کبھی آپ کو Ignore تو نہیں کیا، میں کیسی ماں ہوں؟

دونوں میرا ہاتھ تھام لیتے اور کہتے مما!

''آپ بہت اچھی مام ہیں، سویٹ سی۔ آپ ہمارا آئیڈیل ہو۔''

میرا دل دُکھ سا گیا، شکر ہے میں کسی رشتہ کے لئے تو آئیڈیل ہوں۔

شام کا کھانا میں نے اور دعا نے مل کر بنایا۔ میں نے سویٹ ڈش بنائی۔ سمیر نے کہا۔

''مما اب آپ کام نہ کیا کریں۔ دُعا کو کرنے دیا کریں آپ مری آ کر صرف انجوائے کریں۔'' دوسرے دن ہم سب کشمیر روڈ تک

گئےتھوڑا سا چل کر میں تھک گئی۔

میں نے بچوں اور ثامر سے کہا۔

''آپ گھوم پھر آؤ میں یہیں بیٹھتی ہوں۔''

میں پندرہ بیس منٹ وہاں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ایک جگہ مجھے ہارمونیم کی آواز سنائی دی میں وہاں چل پڑی۔ جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ڈھلوان سے ذرا نیچے ایک چھوٹا مگر بڑے لان کے ساتھ گھر تھا۔ پیچھے درختوں کی لمبی قطار تھی۔درختوں کے پیچھے چرچ تھا۔ میں وہاں ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ ہوا کے چلنے سے پتوں کی سرسراہٹ وہاں چھائی خاموشی کو توڑتی محسوس ہوتی۔ دل میں اُترتا گہرا سناٹا......کوئی ہارمونیم پر گیت گا رہا تھا۔لَے اور سُر اداس، پُرسوز تھے۔میرا دل بھر آیا۔آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔میں نے آنکھیں بند کر لیں، سر پیچھے بینچ کی بیک پہ ٹکا دیا۔میں کافی دیر تک ایسے ہی بیٹھی رہی۔

ایک مانوس خوشبو نے مجھے حصار میں لے لیا۔ میں نے پھر آنکھیں نہ کھولیں۔ میں اس فریب کے زیر اثر رہنا چاہتی تھی...... یہ شعری کی خوشبو تھی۔مخصوص خوشبو...... میں نے آنکھیں کھول دیں۔سیدھی ہو کر بیٹھی کوئی سفید چغہ پہنے، ہاتھ میں تسبیح تھامے کھڑا تھا۔ میں چہرہ نہ دیکھ سکی۔میرا سر جھکا ہوا تھا۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں......؟ ٹھیک تو ہیں آپ......کیا راستہ بھول گئی ہیں......؟ کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔'' کوئی مجھ سے بہت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

یہ کیسے ممکن تھا۔ میں وہ آواز نہ پہچانتی...... جو ہر لمحہ میرے وجود میں گونجتی تھی......وہ آواز جو سننے کے لئے میری سماعت ترس گئی تھی۔

میں نے چہرہ اٹھایا مجھ سے دیکھا نہ گیا...... میں شاید پتھر ہو گئی تھی۔

وہ شعری تھا۔ مجھے یوں لگا......شعری کو دیکھنے کے لئے اپنا چہرہ اٹھانے میں مجھے صدیاں لگ جائیں گی۔آس پاس کا سارا ماحول غائب ہو گیا۔صرف شعری تھا ہر طرف...... پاس بھی......دور دور تک بھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ایک نور کا ہالہ اس کے چہرے پر دکھائی دیا۔میری آنکھوں میں جھڑی لگ گئی۔آنسو میرے گال پر بہہ رہے تھے۔آنسو میری آنکھوں میں بھر آتے تو اس کا چہرہ دھندلا جاتا......آنسو چھلک کر رخساروں پر آ گرتے تو اسے دیکھ پاتی...... وقت تھم گیا۔ ہر چیز ساکت تھی......ہم دونوں تو بے حس وحرکت......زندگی بدلتے وقت کا ایک اور رنگ دکھا رہی تھی۔

میں نے ''شعری'' کہنے کے لئے منہ کھولا میرے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ میں بول نہ سکی۔میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔میں سرتاپا کانپ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور ایسے بلک بلک کر روئی کہ میری ہچکی بندھ گئی۔ میرا دوپٹہ آنسوؤں سے تر...... مجھے جسم سے روح جدا ہوتی لگی......میرے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

وہ میرے سامنے بینچ پر بیٹھ گیا۔اس نے مجھے رونے دیا......چپ نہ کرایا۔ میں خوب رو چکی تو بولا۔

''عیشل مجھے معاف کر دو۔''

میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا، کس بات کی معافی......؟ میں اس کے منہ سے سب سننا چاہتی تھی۔

محبت کرنا اور نبھانا بڑے حوصلہ کی بات ہے۔محبت کرنا اور پانے کی توقع نہ رکھنا، امید نہ رکھنا انتہائی مشکل ہے۔ میں ایک عام سی انسان تھی۔ میں کوئی پارسا نہ تھی۔ میں اس کے منہ سے بہت کچھ سننے کی منتظر تھی...... میں چپ اسے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ میری طرف

دیکھتا...... میں نظریں جھکا لیتی۔
شام اتر آئی تھی۔ چڑیوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ پرندے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔
میں نے خود کو سنبھالا، میں بھول گئی تھی اب میں اکیلی نہیں۔ مجھ سے وابستہ رشتے ہیں۔
ہم کتنے مجبور و بے بس ہیں۔ اپنی مرضی سے ایک لمحہ بھی نہیں جی سکتے۔ جن سے دل ملنا چاہتا ہے مل بیٹھ نہیں سکتے۔
آج میں شعری کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اتنے میں میرے موبائل کی بپ بجی تو سمیر کا نام چمک رہا تھا۔
میں نے Attend کیا۔ ''مما آپ کہاں ہیں؟'' وہ بے چینی سے بولا۔ میں بہت مشکل سے کھڑی ہوئی۔
''سمیر میری جان میں آ رہی ہوں Don't Worry'' میرا بیٹا ہے۔ وہ لوگ Hut پہنچ گئے ہیں۔ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے جانا چاہئے۔ میں نے موبائل پرس میں رکھا اور جانے کے لئے قدم بڑھائے تو شعری بولا ٹھہریں۔ اس وقت آپ کا اکیلے جانا بہتر نہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ میں اور شعری راستے میں کبھی چپ سے ہو جاتے اور کبھی بے تکی سی باتیں کرنے لگتے۔ جب ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں اور کہہ نہیں پاتے تو ایسے بے تکی سی باتیں ہی منہ سے نکلتی ہیں۔ شعری میرے ساتھ چل رہا تھا اور مجھے ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ خواب ہی تو تھا۔ ہم دونوں دریا کے دو کناروں کی طرح ساتھ چل رہے تھے۔ جو ساتھ تو چل سکتے ہیں لیکن مل کبھی نہیں پاتے۔ میں شعری کے منہ سے بہت کچھ سننا چاہتی تھی اور خود بھی بتانا چاہتی تھی۔ وہ سب راستوں سے واقف تھا۔ ایک جگہ پھسلن تھی میرا پاؤں پھسل گیا تو شعری نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں دیکھتی رہ گئی۔ اس ہاتھ کو تھامنے کے تو میں نے کئی خواب دیکھے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے دن رات کا ہر لمحہ اس کے ساتھ جینے کے خواب مگر میرے نصیبوں نے میرا ساتھ نہ دیا۔
آنسوؤں نے میری آنکھوں میں آ کر شعری کا ہاتھ نظروں سے اوجھل کر دیا۔ میں نے آنسو اپنے آنچل میں سنبھال لئے۔ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے لگا میں شعری کا ہاتھ تھامے اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی ہوں۔ میرے آس پاس بادل ہی بادل تھے۔ میرا دل اڑتا جا رہا تھا۔

ہوا کا جھولا بناؤں
محبت کا گیت گاؤں
تیرا ہاتھ تھام کے
محبت کی لے پر
ناچتی جاؤں
بس فضا میں اُڑتی جاؤں

میں شعری کا ہاتھ تھامے خراماں خراماں چلتی فضا میں اڑتی پھری۔ میں خوشبودار ہواؤں سے نیچے اتر آئی۔ جب Hut قریب آئی۔ جیسے ہی میں نے دروازے میں قدم رکھا۔ ممتا میرے دل میں جاگ اٹھی۔ دُعا اور سمیر میری طرف بڑھے تو شعری کو دیکھ کر رک گئے۔ میں نے تعارف کروانے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ شعری بول اٹھا ''شعری جمال'' سمیر نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ ثامر جانے کہاں تھے۔ شعری دروازے سے ہی پلٹ گیا۔ سمیر باہر تک چھوڑنے گیا اور واپس آ کر اس نے بتایا کہ مما انہوں نے Monday کی شام کو ہمیں چائے اور ڈنر پر انوائیٹ کیا ہے۔
میں بہت تھک سی گئی تھی، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں صدیوں سے چلتی رہی ہوں۔ مما کافی پئیں پاپا تو انکل روحیل کے ساتھ

راولپنڈی گئے ہیں۔ایک ہفتہ تک آئیں گے۔'' سمیر نے بتایا۔

میں نے کافی پینے کے لئے مگ منہ کو لگایا تو میرے دائیں ہاتھ سے شعری کی مخصوص خوشبو آئی۔ میں نے مگ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنے ہاتھ کی خوشبو اپنے اندر اتارتی رہی۔ میں مسلسل سوچے جا رہی تھی آخر شعری نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں کیا؟ پھر ایک بار بھی رابطہ نہیں کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں دل کو چیر دینے والا کرب نہیں تھا۔ جب سے میں نے شعری کو دیکھا تھا میرے اندر سکون سا اتر گیا تھا۔ میرے دل میں وہ بے چینی نہیں تھی جو پچھلے 20 پچیس سال سے مجھے تڑپا رہی تھی۔ میری آنکھیں شعری کو دیکھ کر سیراب سی تھیں۔ مجھے ایک ناول میں لکھا ہوا یہ جملہ یاد آ گیا تھا۔

"Satisfaction is the highest level of happiness"

میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ جس سے میں نے محبت کی وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ جس کے لئے میں تڑپی وہ بھی تڑپا تھا۔

شعری کا کہنا۔ ''عیشل مجھے معاف کر دو۔'' اس کا کیا مطلب تھا؟ باہر اچانک سے بارش برسنے لگی۔ مجھے پریشانی لاحق ہوئی۔ شعری راستے میں ہوگا۔ بھیگ نہ جائے، میں پریشان ہو اٹھی۔ سمیر میری پریشانی دیکھ کر بولا۔ مما کیا بات ہے؟ پریشان لگ رہی ہیں میں نے بتایا تو بولا۔ مما انہوں نے اپنا Cell No بھی دیا ہے۔ یہ لیں بات کر لیں میں نے جلدی سے نمبر ڈائل کیا......تو شعری بولا!Yes ó

''میں عیشل آپ بارش میں بھیگ تو نہیں گئے میرا مطلب آپ پہنچ گئے؟

''عیشل میں ٹھیک ٹھاک گھر پہنچ گیا ہوں۔'' شعری ہنس کر بولا۔ تو میں چپ سی ہوگئی۔ شعری بھی کچھ نہ بولا۔ تین چار منٹ میں خاموشی سے موبائل کان کو لگائے کھڑی رہی۔ وہ پھر بولا۔'' آپ ٹھیک ہو؟'' میں کچھ نہ بولی۔'' Ok'' کہہ کر بند کر دیا۔ میں نے ٹھنڈی کافی ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتار لی۔ مجھے اچانک ہی ثامر کی بھی فکر ستانے لگی۔ 25 سال کی رفاقت تھی یہ بھی بھولنے والی نہ تھی۔ سمیر پاپا کو فون کرواور ان سے پوچھو ٹھیک ٹھاک پہنچ گئے ہیں۔

میں واش روم چلی گئی شاور کھول کر باتھ روم کے ایک کونے میں دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل محبت میں بٹا ہوا تھا۔ کبھی شعری کی محبت بے چین کرتی تو میں مجرم سی بچوں کی طرف آتی۔ ثامر کو دیکھتی تو احساس ہوتا شاید میں خدمت گزار بیوی نہیں ہوں۔ پھر اس کے کام کرنے لگتی۔ میں 25 سال سے ایسے ہی ہلکان ہو رہی تھی۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میرے دل میں درد سا اٹھا۔ میں نے کھینچ کھینچ کر لمبے سانس لینے شروع کئے۔ باتھ روم سے نکل آئی اور بیڈ پر گر گئی۔ میں جو بے خوابی کا شکار رہی تھی دل میں اٹھتی ٹیسوں کے باوجود میں کمبل اوڑھ کر لیٹی تو میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

میں نے دیکھا ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ میں جس جگہ بیٹھی تھی وہاں میرے دائیں طرف ایک فوارہ چھینٹے اڑا رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ دور کہیں کوئل کوک رہی تھی۔ میں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ میں بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک سے مجھے شعری آتا دکھائی دیا۔ میرا دل کھل اٹھا، میں بے قراری سے کھڑی ہوگئی۔ اس کی طرف بڑھی مگر شعری میری طرف نہ آیا پھر جدھر سے آیا تھا اُدھر پلٹ گیا۔ میں پیچھے بھاگی۔ مگر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے اُسے آ کر پلٹ کر جاتے دیکھا تو رو پڑی۔ پتہ نہیں کیوں خوشی میرے پاس آ کر پلٹ جاتی تھی۔ میں تکیہ کے ساتھ کمر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے شعری پھر بچھڑ جائے گا۔ پھر باقی رات میں سو نہ سکی۔ یہی دُعا کرتی رہی کہ شعری کہیں کھو نہ جائے۔

اگلے دن سوموار تھا۔ مجھے بچوں کو لے کر شعری کی طرف جانا تھا۔ میرے سے زیادہ سمیر اور دعا کو جانے کی جلدی تھی۔ ہم تیار ہو کر

نکلے شعری ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی، خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ ہلکی ٹھنڈی سی دھوپ اب صرف درختوں کے اوپر والے پتوں اور شاخوں پر سے بھی آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی۔ میں چپ چاپ چل رہی تھی۔ سمیر اور دعا درختوں، پہاڑوں اور پتوں کے رنگ وساخت پر باتیں کرتے جا رہے تھے۔ شعری نے ہمیں آتا دیکھ کر دور سے ہی ہاتھ ہلایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرے قدم مَن مَن بھر کے ہو گئے۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ میں ہولے سے لڑکھڑا رہی تھی۔ سمیر نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ میں قدرے توقف سے آگے بڑھی۔ عیشل کیسی ہیں آپ؟ میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ میرے دل کی حالت پھر بدل رہی تھی۔ میں خود پہ قابو پانے کی کوشش میں کسی حد تک ناکام اور کسی حد تک کامیاب بھی تھی۔ ہم سب سٹنگ روم میں بیٹھے تو سامنے کھڑکی سے درختوں سے بھی دھوپ غائب ہو چکی تھی۔ شام سرمئی ہو گئی۔ پرندوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ کچن سے چائے کی خوشبو آنے لگی۔ ایک دم سے مری کی شام میرے گھر کے صحن میں اترتی شام جیسی ہو گئی۔ جب شعری پڑھاتا۔ مما چائے بناتی، عروش کی چھیڑ چھاڑ، فقرہ بازی اور شعری کا ہنسنا، ڈیڈی کا مسکرانا۔ عیشل پلیز چائے، سمیر اور دعا نے چائے ختم کی اور شعری سے لائبریری دیکھنے کی فرمائش کی۔ شعری انہیں لئے لائبریری کی طرف بڑھا۔ میں نے چائے کا کپ پی کر واپس رکھا۔ شعری کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کسی کو کھانے کی ہدایات دے رہا تھا۔ پھر اس کے قدموں کی چاپ قریب آتی محسوس کی۔

''آپ نے تو چائے کے ساتھ کچھ بھی نہیں لیا۔ عیشل بالکل بھی نہیں بدلی۔'' وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ سرونٹ چائے کے برتن اٹھا کر لے گیا۔ تو ہم چپ چاپ بیٹھے رہے۔ شعری نے اب تک مجھے پُرتکلف لہجے میں مخاطب کیا تھا۔

پھر شعری بولا۔ ''عیشل میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ مما، ڈیڈی کی محبت بھی ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میں نے جو وقت آپ کے گھر گزارا وہی میری زندگی کا خوبصورت ترین وقت تھا۔ جب میں آخری دفعہ آپ کے گھر سے نکلا تو یہ سوچ کے آیا تھا کہ جا کر میں اپنے اماں ابا کو بھیجوں گا، میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے اپنے اور تمہارے بارے میں۔

جس دن میں ابا اماں سے بات کرنے گاؤں جا رہا تھا۔ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میری دونوں ٹانگوں پر شدید چوٹیں آئیں۔ ہڈیاں کئی جگہوں سے فریکچر ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر کہتے تھے اب میں چل نہیں پاؤں گا، اماں بہت پریشان تھیں۔ میں ان کی گود میں کھیلنے والا پہلا بچہ تھا۔ پہلوٹھی کا بچہ تو ویسے ہی بہت پیارا لگتا ہے۔ میں خاندان بھر کا لاڈلا تھا۔ میں ہسپتال سے گھر آیا تو اماں پاگل سی ہو گئیں۔ وہ بے چین پھرا کرتیں۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اپنے پیروں پر چل سکوں۔ جو کوئی تعویذ، ٹوٹکا، دم بتاتا اماں ایک یقین سے شروع کر دیتی۔

میں نے چاندنی راتوں میں اماں کو صحن میں بیٹھے روتے دیکھا۔ میں بھی دُکھی تھا، میں خود کو اب تمہارے قابل نہ سمجھتا تھا۔ میں رات کو روتے سو جاتا۔ ہر رات تمہیں خواب میں دیکھتا، میں نے تمہارے ایم اے کے رزلٹ کا بھی خواب دیکھا۔ تمہاری منگنی، شادی کا بھی خواب دیکھا۔ تمہارے ہاتھوں پہ مہندی لگتی دیکھی، جس دن تم نے ڈارک گرین اور ریڈ کلر سکیم کا برائیڈل ڈریس پہنا۔ میں نے تمہیں عروش کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا۔ میری حالت پاگلوں کی سی تھی۔ میں بہت رویا...... میں بکھر گیا تھا۔ سمیٹنے والا کوئی نہ تھا۔ سارا دن اماں کے سامنے مسکراتا رہتا رات ہوتے ہی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ میں تمہیں بھول جانے اور مرنے کی دُعا کرتا۔ عیشل میں نے زندگی میں کبھی کسی کو اتنا نہ چاہا۔ نہ جانے تم میں ایسی کیا بات تھی میں ہزار کوشش سے بھی تمہیں نہ بھول سکا۔ میں اکثر تمہیں خواب میں روتے دیکھتا۔ مجھے پچھتاوا تھا کہ میں تم سے کچھ تو کہہ دیتا۔

ایک رات میں نے خواب دیکھا تم بہت لڑتی ہو...... روتی ہو۔ میں تمہیں دلاسا دینے تمہاری جانب بڑھتا ہوں۔ تم مجھے بے وفا، سنگدل جانے کیا کچھ کہتی ہو۔ جب میری آنکھ کھلی میں نے خدا سے ایک دُعا مانگی۔ میں نے کبھی اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ تمہیں بھی

نہیں کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ تمہارا حصول مشکل نہیں ۔ مما ، ڈیڈی تو مجھ پر جان نچھاور کرتے تھے ۔ اور تمہاری آنکھوں میں ، میں نے اپنا عکس دیکھا تھا ۔ میرا عکس تمہاری محبت بھری آنکھوں کے پانیوں میں تیرتا تھا ۔

شعری نے ٹیبل پر بڑا پانی کا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیا ۔ بولتے بولتے وہ یوں ہانپنے لگا جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے لوٹا ہو ۔

میں نے اس کے منہ سے اپنی محبت کا اقرار سن کر دل کو پر لگاتے اڑتے دیکھا ۔ میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اور آنسو میری آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے ۔

شعری نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی ۔

''عیشل ! میں نے رب سے دعا مانگی تھی کہ میں اپنے پیروں پر چل سکوں تو میں خود کو اس کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گا ۔ ایک بار صرف ایک بار تم سے ملا دے ۔ میں ساری زندگی خدا کی خوشنودی کے لئے زندگی تیاگ دوں گا پھر پتہ نہیں کیسے ہوا......؟ میری فزیوتھراپی شروع ہوئی اور میں تین ماہ کے دوران ہی چلنے پھرنے لگا ۔ اگر چہ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی ۔ مگر سب خوش تھے سخت محنت اور کوشش ، اماں کی دُعاؤں کے طفیل میں اللہ سے کیا وعدہ نبھا رہا ہوں ۔ مین نے بے سہارا بچوں کے لئے ''ہمارا گھر'' کے نام سے یہاں ایک ادارہ بنایا ۔ آج تمہارے سامنے ہوں تم سے شرمندہ ہوں کہ اپنی کوئی خبر نہ دے سکا ۔ اگر دیتا بھی تو کیا فائدہ ۔ میری زندگی اب بہت مختلف تھی ۔ پلٹ کر کیونکر آتا ۔ اماں نے میرا گھر بسانے کی مجھے راضی کرنے کی بہت سعی کی مگر میں نہ مانا ۔ ایک دن انہوں نے اپنی محبت کا......ممتا کا واسطہ دیا مجھے پھر تمہارے بارے میں بتانا پڑا ۔ اس کے بعد اماں نے کبھی میری شادی کا ذکر نہ کیا ۔ البتہ جب تک زندہ رہیں ۔ اکثر و بیشتر تمہارا ذکر لے بیٹھتی ۔'' اب وہ بات کرتے کرتے آپ سے تم پر آ گیا تھا ۔

وہ پوچھتی ۔ ''شعری! عیشل کیسی دِکھتی تھی......؟''

میں سب کچھ بتاتا ۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ میں دل کی سب باتیں ان سے Share کرلوں ۔ میرے دل کی دل میں نہ رہیں ۔ وہ میرے دل کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی تھیں ۔

میں نے کل شام تمہیں یہاں بیٹھے دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا......کہ میری تم سے ملاقات ہو سکتی ہے ۔ مجھے اپنی دعا کی قبولیت کا یقین ہو گیا ۔

عیشل ! میں یہ سب بہت پہلے کہنا چاہتا تھا ۔ میرے دل پر بوجھ تھا ۔ یہ مجھے جینے نہ دیتا تھا ۔ مجھے یوں لگتا کہ میری عبادت میں خلوص نہیں ۔ میں دل کی بے چینی و بے قراری کو دبانے کے لئے اللہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں ۔ آج میرے دل کو قرار آئے گا ۔ اگر تم نے مجھے معاف کر دیا ۔''

وہ مجھ سے معافی کا طلبگار تھا ۔ جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا میرا من شانت ہو گیا ۔ دلِ وحشی کے بھپرتے پانیوں میں سکون در آیا ۔ من شانت تن شانت ۔ مجھے اپنے وجود میں سکون و قرار کے گیت کی لے سنائی دینے لگی ۔ ہم دونوں اب چپ چاپ بیٹھے تھے پھر میں نے ہمت کی......اور کہا ۔

''شعری! اس نارسائی کے سفر میں نہ میں تنہا تھی نہ تم ۔ ہم اللہ کی رضا سے راہِ محبت کے راہی بنے ۔ الگ ہوئے کرب ، اذیت سہی ۔ مجھ سے معافی طلب نہ کرو ۔ میں تو یہی سننے کو زندہ تھی ۔ ایک بار آزما تو لیتے ، رابطہ کرتے میں کبھی راہ میں رکاوٹ نہ بنتی ۔ ہم دوستوں کی طرح مل پاتے اور عام سی باتیں کر کے اپنے دلوں کو سمجھاتے......پھر شاید ہم عادی ہو جاتے......کہ ہم اسی حد میں رہ کر محبت کر سکتے تھے ۔ زندہ رہ سکتے تھے ۔

شعری! کبھی کبھی دل کو جھوٹی تسلی دے کر بھی زندہ رہنے پر مجبور کرنا پڑتا ہے۔ دل بہل جائے تو زندگی کڑوی کسیلی نہیں رہتی۔ میں نے زندگی کا پل پل کیسے گزرا......؟ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک ہی زندگی تھی جو آپ کے نام اور یادوں کے سہارے گزر گئی۔ زندگی میں سب کچھ خود ہی فرض نہیں کر لینا چاہئے کبھی دوسروں پر بھی بھروسہ کر لینا چاہئے۔ آپ ایک بار مل لیتے۔ شاید زندگی کا ڈھب کچھ اور ہوتا۔ میں بھی کچھ پل دل سے، جی سے گزار لیتی۔''

سمیرا اور دعا آ چکے تھے، کھانا ٹیبل پر لگ چکا تھا۔ شعری بہت محبت سے بچوں کو کھانے کے لئے کبھی کوئی ڈش تو کبھی کوئی پیش کر رہا تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے بہت غور سے اس کو دیکھا۔ ایک لمحہ کو مجھے خیال ہوا۔ کہیں ہم آخری بار تو نہیں مل رہے۔ پھر میں نے خود کو جھڑ کا نہیں ایسا نہیں۔

رات ہو چکی تھی چودھویں کا چاند درختوں کے پیچھے سے نکلتا اور چھپ جاتا۔ چاندنی کھلکھلاتی اسے ڈھونڈ لیتی۔ اس کا ہاتھ تھام کر بادلوں میں چھپ جاتی۔ ہنسی کی کھنک سنائی دیتی۔ جیسے کوئی محبت کی بارش میں نہاتے ہوئے قہقہہ لگائے۔

محبت کرنے والوں کے ساتھ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے۔ کہ جب محبت ان کے بیچ آ کھڑی ہو۔ تو وقت تھم جاتا ہے۔ رُک جاتا ہے فضا فطری نغموں سے گنگنا اٹھتی ہے۔

وقت کو کب پَر لگتے ہیں، تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ پھر دل میں خواہش انگڑائی لیتی ہے۔

''کاش وقت تھم جائے اور ابھی تھم جائے۔''

موسم میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی برف باری شروع ہوتی تو کبھی رُک جاتی۔ پہاڑوں نے سفید لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ کسی وقت سورج کی پیتل جیسی دھوپ پہاڑوں پر جمی برف پر پیلا رنگ بکھیر دیتی۔ موسم نارمل ہوا تو ثامر نے گاڑی بھجوا دی کہ میں واپس لاہور جا رہا ہوں، میں بھی بچوں کو لے کر پہنچ جاؤں۔ بچوں نے Packing کی۔ سامان گاڑی میں رکھا بچوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے شعری سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بچے اس سے بہت گھل مل گئے تھے۔ محبت سمیٹنے کے معاملہ میں شعری بہت خوش قسمت تھا۔ دونوں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہم آپ کو کبھی نہیں بھولیں گے۔''

میں نے بہت غور سے شعری کو دیکھا اس کا چہرہ، سفید اور اُترا اُترا سا تھا۔ شکستہ سا میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

''شعری اپنا خیال رکھنا۔''

شعری بے اختیار بولا۔ ''تم بھی''

میں نے کہا مجھے اپنا خیال رکھنے کی اب عادت نہیں رہی۔ گاڑی کی طرف جا کر پھر پلٹی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شعری! مجھے اپنی دعا میں ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں چاہتی ہوں میں سدا دعا بن کے آپ کے ساتھ رہوں۔ پتہ نہیں اس نے کیا کہا۔

میں گاڑی میں آ بیٹھی۔ شعری نے دعا کے سر پر ہاتھ پھیرا، دُعا دی۔

''سدا خوش رہو۔''

سارا رستہ میرے بچے شعری کی باتیں کرتے رہے۔ میرے دل میں اک درد اٹھا۔ میں نے شال کندھوں پر لپیٹ لی۔ مجھے سارے بدن میں اب درد محسوس ہو رہا تھا۔ محبت سے عشق تک۔ سارا راستہ درد کا رستہ تھا۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا میری روح میرے جسم سے الگ ہو جاتی۔ جب پلٹتی مجھے اپنی کلائیوں میں کمر میں، ٹانگوں میں غرض سارے اعضاء میں سخت تکلیف دہ درد ہوتا۔

لاہور آ چکا تھا گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا شعری نے پکارا ہے مجھے اپنی سماعت کا دھوکا لگا۔ پلٹ کر دیکھا درد کی لہر میرے

دل میں اٹھی میرے منہ سے کراہ نکلی ۔سمیر نے مجھے گاڑی سے ٹیک لگاتے آنکھیں بند کرتے دیکھا تو تھام لیا۔

''مما آپ کو تو بہت تیز بخار ہے ۔ بتایا کیوں نہیں ۔''

میں نیند،غنودگی یا پھر خواب کی وادی میں اتری تھی ۔ میرا ہاتھ شعری کے ہاتھ میں تھا ۔ میرا وجود فضا میں تحلیل ہو گیا ۔ میری روح خوشی سے ناچتی اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھی ۔ میں سرشار سی دنیا کی قید و بند سے نکل آئی ۔

شعری ،عیشل کو خدا حافظ کہہ کر جیسے ہی پلٹا لڑکھڑایا خود کو سنبھالتا ہوا دل پر ہاتھ رکھے ۔اپنے کمرے میں بیڈ پر آن گرا ۔ چند گھنٹوں کی مسلسل بے ہوشی کے بعد وہ عیشل کے ساتھ نئے ابدی سفر پر گامزن تھا ۔اس نے دیکھا عیشل سفید شفاف ریشمی گاؤن پہنے سر پر پھولوں کا تاج سجائے آئی ۔اس کا ہاتھ تھاما اور آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتی بادلوں میں کھڑی ایک بگھیا میں بیٹھی اور دور، بہت دور چلی گئی ۔اس کے چہرے پر اطمینان تھا ۔ زمین پر بھاگتی دوڑتی زندگی نے دیکھا محبت کرنے والے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں ۔انہیں اب ساتھ ساتھ رہنا تھا ۔کبھی نہ بچھڑنے کے لئے ۔

زندگی ان کی جدائی دیکھ کر سرِ شام روتی تھی ۔سسکتی تھی آج وہ مسکرا رہی تھی ۔ یوں جیسے نئی ماں اپنی گود میں اپنی تخلیق کو کرب سہہ کر جنم دینے کے بعد دیکھ کر مسکراتی ہے ۔

24 دسمبر کی سرد رات آہستہ آہستہ بیت رہی ہے ۔ چرچ میں رونق بڑھتی جا رہی ہے ۔مناجات ،عبادت اور دُعا سے سرشار روحیں خالق کی مدح کے گیت گاتی ہوئی دلوں میں سکون انڈیلتی ایک دوسرے کو محبت ،امن اور دوستی کا پیغام دیتی نظر آ رہی ہیں ۔سمیر اور دعا کا ماموں عروش کئی سال بعد وطن واپس لوٹا تو بچوں کو آئس کریم کھلانے چرچ کے دائیں طرف آئس پارلر لایا تھا ۔آئس کریم کھا کر چرچ کے بیک پر واقع پارک کی طرف چلا آیا ۔ وہ دونوں کو لے کر اس جگہ آ کھڑا ہوا ۔ جہاں اس کی دیدی کا جوتا ٹوٹ گیا ۔ وہ ٹوٹا جوتا پکڑے شعری کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی اور آبلہ پا چلتی رہی ۔

چرچ کے گھڑیال نے 12 بجائے تو گھڑیال کی ٹن ٹن ٹن بیلز اور مناجات کی ملی جلی آوازوں سے فضا گونج اٹھی ۔عروش نے بچوں کو بتایا ۔

''میں اور تمہاری مما ہر 24 دسمبر کی رات یہاں آئس کریم کھانے آتے تھے ۔ جب چرچ سے ''ہیپی کرسمس'' کا شور بڑھتا میں دیدی کو Happy Birthday کہتا ۔اسے ٹیولپ اور گلاب کا گلدستہ پیش کرتا ۔بھیگتی رات دھیرے دھیرے گزرتی ہمارے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگتے ،گھر جا کر وہ مجھے گرم گرم کافی بنا کر دیتی ۔ہم اپنے بچپن کی باتیں کرتے سو جاتے ۔''

چرچ میں شور بڑھتا جا رہا تھا ۔ دُعا پارک میں ایک بینچ پر آ بیٹھی ۔اسے یوں لگا جیسے مما اسے کہانی سنا رہی ہو ۔

''ایک شہزادی بہت خوبصورت ،خاموش طبع لانبے بالوں والی تھی ۔شہزادہ اسے دریا کے کنارے انتظار کرنے کو کہہ کر چلا گیا ۔ پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا ۔شہزادی وہیں کھڑی رہی ۔موسموں نے کئی بار اپنی چال بدلی ، پھول کھلے ،مرجھائے ، دریا بھی رستہ بدلنے لگا ۔مگر شہزادہ واپس نہ آیا ۔

شہزادی کے سنہری لانبے بالوں میں برف گرنے لگی ۔ ہر سال گرتی برف شہزادی کو کفن پہنا گئی ۔ وہ گہری نیند سو گئی ۔شہزادی کو دیکھ کر دریا کا پانی بھی چاندی بن گیا ۔ جو درحقیقت شہزادی کے آنسو بہنے سے وہاں جاری ہو گیا تھا ،دریا کے کنارے برف کا ایک محل تعمیر ہوا ۔ پانی نے شہزادی کو اس محل کے اندر اُچھال دیا ۔محل کا دروازہ بند ہو گیا ۔

سنا ہے کہ شہزادہ کے آنے سے شہزادی زندہ ہو جائے گی ۔'' دُعا رو رہی تھی اس نے جان لیا تھا وہ شہزادی اس کی مما اور شہزادہ شعری

انکل۔اس نے چرچ کی طرف دیکھا وہاں اب شوراور بھیڑ قدرے کم تھی۔

سمیر نے اپنی بہن کو گلے لگا لیا دونوں سسک رہے تھے۔بے آواز رو رہے تھے۔چرچ کے گھڑیال کی چھوٹی سوئی 3 پہ تھی اور بڑی 9 پر تھی۔عروش دونوں کو ساتھ لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔

دُعا تین کافی کے مگ بنا کر لے آئی۔وہ چپ چاپ گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔دور کہیں تہجد کی اذان سنائی دی ہر طرف ایک ہی صدا تھی۔دُعا،روح کو اللہ سے جوڑتی ہے۔اس سے ناطہ جوڑنے میں ہی انسان کی نجات ہے۔

❍......❖......❍

بندگلی

''محبت زمینی سفر پر آسمانی تحفہ ہے۔ یہ نصیب والوں کو ملتی ہے۔ زبردستی نہ ہوتی ہے۔ نہ کسی کو کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ دلوں پر اختیار جس کو ہے وہی جب چاہے جس دل میں چاہے اُتار دے۔''

گڑیا بہت دیر سے اپنی پرانی ڈائری کھولے بیٹھی یہ پیرا کوئی دس بیس مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ اسے یاد آیا۔ جب اس نے پہلی بار پڑھا تھا بہت ہنسی تھی۔ بھلا محبت بھی نصیب سے ملتی ہے۔ جس سے ہوجائے اس کو بھی کروا کر چھوڑو۔ اسے بھی کہیں کا نہ چھوڑو۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ دیوانوں سی باتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ آج زندگی کے کئی ماہ و سال گزرنے پر احساس ہوا تھا۔ اس دنیا میں سب Preplane ہے۔ کس سے ملنا ہے۔ کب بچھڑ جانا ہے۔ کہاں ہنسنا ہے کہاں رونا ہے۔ اب معلوم ہوا زندگی میں اپنی ''مَیں'' کی کوئی بساط نہیں۔

ایک چڑیا کھڑکی میں آ کر چوں چوں بولی تو گڑیا چونکی۔ وہ دو گھنٹوں سے یونہی بیٹھی تھی وہ پرانی گڑیا کو ڈھونڈنے نکلی۔ جو ہر محفل کی جان ہوتی تھی۔ کوئی بھی فنکشن ہوتا ڈھولک اس کے پاس ہوتی۔ ڈانس کے لئے بھی سب سے پہلے اس کو ہی پکارا جاتا۔ لمبے سیاہ کمر سے نیچے لہراتے بال، کالے سیاہ ناگ کی طرح مست اس کے ساتھ ناچتے بڑی پھوپھو واری صدقے جاتی، ممانی آگے بڑھ کر روپے وارتی اور اسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے کو دیر نہ کرتی۔ اماں ڈپٹ کر کہتی چل اب بس کر۔ گانے کا مقابلہ ہوتا۔ کسی کو جیتنے نہ دیتی۔ اسے پتہ تھا وہ بہت اچھا بول لیتی ہے۔ لکھ لیتی ہے تحریری یا تقریری مقابلہ ہوتا جیت کر لال سرخ چہرے پر فتح کی چمک لے کر ابا کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔

''ابا آپ کی گڑیا سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔'' چہکتی پھرتی ناگن چوٹی یوں تفاخر سے لہراتی کہ سامنے والے کے چہرے پر جالگتی۔ مگر اسے کس کی پروا......؟

زندگی جب غرور کے نشہ سے آشنا کرتی ہے یوں لگتا ہے کہ وقت اب اسی دھارے پر بہے گا......مگر وقت کے پرواز کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ اتنے دھیرے سے اور کبھی ایسی طوفانی رفتار سے گزرتا ہے کہ پتہ نہیں چلتا۔ یہ اپنی مسافرت میں کئی رنگ بدلتا ہے۔ محبت کرنے والے چہرے غائب ہو جاتے ہیں......سمجھ نہیں آتی شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرنے والے کہاں چلے جاتے ہیں۔ وقت اپنا رنگ ہر چہرے پر پھیرتا ہے۔ مگر بہت آہستہ سے......شاید یہ اپنی بے وفائی کا احساس نہیں دلانا چاہتا۔

گڑیا کے ساتھ بھی جو کچھ ہوا بہت ہی غیر متوقع تھا، ابھی تک اسے یقین نہ آتا تھا۔ اس کے ساتھ جو ہوا اس کے اپنوں نے کیا تھا یا پھر وہ اپنے تھے ہی نہیں۔

انسان بہت ہی بھولا واقع ہوا ہے۔ وہ جسے اپنا سمجھتا ہے وہ ہوتا ہی نہیں وہ تو اپنی کوئی غرض کی خاطر اپنا ہونے کا یقین دلاتا

ہے...... یہ یقین بھی کہیں جانے کیوں ایسے ہی بنا سوچے سمجھے ہو جاتا ہے۔
گڑیا نے اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹا تو اسے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا۔ یہ کیا وہ رو رہی تھی اور آنسو چہرہ بھگو رہے تھے۔ اسے علم ہی نہ ہوا وہ خود سے کتنی بے خبر ہوتی جارہی تھی۔ شام ہونے کو تھی پرندوں کی الوداعی آوازیں ان کے اپنے آشیانوں کی طرف جانے کا پتہ دے رہی تھیں۔
''گڑیا اٹھو نیچے چلو مغرب کی اذان ہونے کو ہے۔ شام کو اکیلے نہیں بیٹھتے۔'' ابا دروازے میں کھڑے تھے۔ گڑیا اپنی ڈائریاں سمیٹتی اٹھ بیٹھی اور ابا کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر گئی۔ وضو کیا نماز کے لئے کھڑی ہوئی تو دل بھر آیا۔ اور سجدہ میں جاتے جاتے سسک پڑی۔
''اے اللہ! میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں؟ تُو مجھے ایسے نہ آزما۔ بس سیدھی سادی سی زندگی گزارنے دے۔ انہونی سے مجھ کو بچالے۔ میں بہت کمزور ہوں۔'' دور کھڑی جاتی شام ہنس پڑی۔ ''پگلی تُو کیا جانے کون کمزور ہے۔ کون طاقتور، کون آزمانے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے۔ جو کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے۔ جس کے حکم سے ہر چیز گھومتی ہوئی رقص کرتی ہے۔''
گڑیا کے ساتھ اب تک بہت عجیب سا ہوا تھا۔ وقار بھائی بڑے ماموں کا بیٹا اکثر ہی سکول جاتے اسے دیکھتا۔ کھیل میں اسے ہارنے نہ دیتا۔ اپنے سے 10 سالہ بڑے وقار بھائی کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتی تھی۔ ایک بار عید پہ انہوں نے کئی رنگوں کی ڈھیر ساری چوڑیاں لا کر دیں تو وہ خوش ہو کر بولی وقار بھائی آپ کتنے اچھے ہیں۔ وقار بھائی بولے۔
''گڑیا تم مجھے بھائی نہ کہا کرو۔'' گڑیا بولی اچھا وقار بھائی وہ کیوں؟
تمہیں بھی پتہ چل جائے گا۔ مگر آپ تو بڑے ہیں میں آپ کا نام تو نہیں لے سکتی نا۔ گڑیا سوچتی رہی بھلا میں وقار بھائی کو بھائی نہ کہوں تو پھر کیا کہوں...... بھائی کیوں نہ کہوں؟ چھوٹے ماموں کی علینہ بھی بھائی کہتی ہے۔ اسے بھلا کیوں نہیں منع کرتے۔ پھر عید کے تیسرے دن جب بڑی ممانی نے اس کو گلے سے لگا کر کہا۔ ''بھائی صاحب گڑیا تو مجھے دے دیں۔ میری بیٹی بنا دیں۔'' ابا یوں بولے جیسے ابا کو سب پتہ تھا۔
''شکیلہ، گڑیا اور وقار کی عمر میں بہت فرق ہے۔ گڑیا تو ابھی پڑھ رہی ہے۔ بہت چھوٹی ہے ویسے بھی میرا گڑیا کا رشتہ خاندان میں کرنے کا ارادہ نہیں کیونکہ بڑے بھائی بھی اپنے عمیر کے لئے کہہ رہے تھے۔ اب جس کو نہ دوں رشتہ وہ ناراض ہوگا۔ بہتر ہے کہ میں گڑیا کا رشتہ خاندان سے باہر کروں۔ بڑی ممانی جانتی تھیں ابا کی بات پتھر پہ لکیر ہوتی ہے۔ سو چپ چاپ چلی گئیں مگر اگلے دن قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ وقار بھائی نے خودکشی کر لی۔ اسے جب خبر ہوئی لرز گئی۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جب وہ ماموں کے گھر داخل ہوئی اسے یوں لگا ہر ایک نے گویا کہا ہو ''وقار کی قاتل آگئی'' ممانی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ چیخ کر بولی۔ ڈائن تُو میرے گھر کیوں آئی؟ تُو میرے بیٹے کو کھا گئی۔ وقار بھائی سفید بے داغ چادر کے نیچے ابدی نیند سوئے پڑے تھے۔ ان کی دی کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں، ربن پنسلز اس کے آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا۔ وقار بھائی آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ جان ہی دے ڈالی۔ کچھ دیر تو انتظار کرتے شاید مجھے بھی آپ سے ہو جاتی۔ کیا یہ ادراک آپ کے لئے کم اطمینان کا باعث ہوتا کہ جسے آپ چاہتے ہیں وہ بھی آپ کو......اس کے آگے وہ سوچ نہ سکی۔ دھڑام سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔
جب ہوش آیا تو خود کو گھر میں پایا۔ پُر ہول سناٹا سارے گھر پر طاری تھا۔ پتہ نہیں کیا وقت تھا۔ اس نے کروٹ لینا چاہی تو سر میں ٹیس اٹھی، گرنے سے سر پر چوٹ لگ گئی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھی اور کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔

''وقار بھائی آپ نے کیوں ایسا کیا؟ کیا ملا؟ مجھے کیوں آپ جاتے جاتے زندہ درگور کر گئے ۔میرے پلو پر آپ داغ لگا گئے قاتل کا۔اب کون میرا یقین کرے گا۔سب عورتیں سمجھ رہی تھیں کہ میں نے محبت کے سبز باغ آپ کو دکھائے ۔تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ۔دونوں سے بجتی ہے۔'' سب مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔میں کس کس کو بتاؤں کہ میں تو لاعلم تھی۔ مجھے تو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ورنہ میں آپ سے چوڑیاں نہ لیتی ۔ابا کی کتنی بدنامی ہوئی ہے۔سب کے چہرے بدل گئے ہیں سب ماموں،ممانی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے ۔اماں ہوتیں تو وہ میری وکالت کرتیں اور سب کو یقین بھی ہو جاتا۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی ۔سر پہ چوٹ اور درد سے اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے مضبوطی سے کھڑکی کا پٹ پکڑا اور دیوار کا سہارا لیتی پھر بیڈ پر آ گری ۔اور گہرے اندھیروں میں اترتی چلی گئی۔

وقت اپنا رنگ بدل چکا تھا۔اپنے پرائے ہو چکے تھے۔دن اور رات آپس میں باتیں کر رہے تھے۔اس دنیا میں کوئی چیز، جذبہ سدا کے لئے نہیں ۔نہ خوشی کو پائیداری حاصل ہے نہ غم کو، دولت شہرت سب مایا جال ہیں ۔دھوپ چھاؤں ہے،آج کسی کے پاس تو کل کسی اور کے پاس۔

گڑیا چپ سی ہو گئی تھی ۔ابا نے شہر چھوڑ دیا۔ وہ لوگوں کے سوالوں کا جواب نہ دے سکتے تھے۔سو چپکے سے بدنامی کے ڈر سے چھوڑ کر اپنے دوست صفدر علی شاہ کے پاس آ گئے ۔اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی ۔ایک بیوہ بہن تھی ۔ جسے سب احتراماً آپا جی کہتے ۔صبح سے شام تک عورتیں کبھی دم کروانے اور کبھی اپنے مسائل سنانے آتیں ۔آپا جی بڑے پیار و محبت سے غور سے سن کر سمجھاتیں ۔انداز ایسا محبت سے بھرپور ہوتا کہ روتی ہوئی آتیں اور ہنستی ہوئی جاتیں ۔گڑیا سارا دن چپکے سے سب دیکھتی رہتی ۔شام کو چائے بنا کر آپا جی کے آگے رکھتی اور اپنے کمرے میں آ کر لیٹ جاتی ۔

جگہ بدلنے سے دل کی حالت کبھی نہیں بدلتی ۔بس وہی رہتی ہے۔تنہائی ہجوم میں بھی اپنا آپ برقرار رکھتی ہے۔دل بے قرار کو چین کب ملے گا......احساسِ ندامت کب میرے دل سے رخصت ہوگا۔کیا اب میں کبھی کھل کر ہنس بھی سکوں گی یا نہیں......اَن گنت سوالات اس کے دماغ میں گردش کرتے رہتے۔

ابا نے اس کا داخلہ کالج میں کروا دیا۔اب گڑیا نے خود کو کتابوں کے ساتھ مصروف کر لیا۔کالج سے آ کر بھی کمرے میں گھسی پڑھتی رہتی۔حویلی میں صرف وہ اور آپا جی تھیں ۔ایک بُوا اندر باہر کے کاموں کے لئے مختص تھی سو دم کروانے اور اپنے مسائل کے حل کے لئے جو خواتین آتیں وہ بوا کی مرضی کے مطابق آپا جی سے مل پاتیں ۔آپا جی کہتی بھی بُوا نہ روکا کرو۔کسی کو بھی آنے سے، یہ کون سا اپنی مرضی سے آتی ہیں ۔بھیجنے والا ان کو بھیجتا ہے۔آپا جی نکھرے رنگ و روپ کی بارُعب نرم مزاج خاتون تھیں ۔چہرے سے بالکل بھی وہ آپا جی نہ لگتی تھیں ۔باجی کہنے کو دل چاہتا۔مگر خاندانی عظمت کو مدِنظر رکھتے ہوئے گڑیا بھی آپا جی کہتی اور سوچتی آپا جی کی شادی کب ہوئی ہوگی ۔اور بیوہ بھی ہو گئیں ۔شام کو آپا جی مغرب کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں ٹیبل پر جھکی سُرخ رنگ کی ڈائری لکھنے میں اتنی محو ہوتیں کہ آس پاس کی کوئی خبر نہ ہوتی ۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔وہ لکھتی چلی جاتیں ۔عشاء کی نماز کے کچھ وظائف کے بعد پھر سے لکھنے لگتیں ۔گڑیا کا کمرہ ان کے کمرے کے عین سامنے تھا۔کبھی کبھی رات کو دیر تک پڑھتی تو دیکھتی آپا جی کے کمرے میں ٹیبل لیمپ کی مدہم سی روشنی پھیلی ہوتی اور ٹیبل پر جھکی ہوتیں ۔

ابا گڑیا کو یہاں لا کر قدرے مطمئن تھے ۔صفدر علی شاہ صاحب کے ساتھ کاروبار میں تمام جمع پونجی لگا کر برابر کے شریک تھے ۔ پیچھے کی کوئی خبر لی نہ رابطہ رکھا۔صفدر علی شاہ کا لنگوٹیا یار تھا۔دفتر سے آ کر دونوں پرانی باتیں یاد کرتے اور ہنستے ۔ان کی ہنسی ذرا سی دیر کے

لئے ساری حویلی میں گھومتی پھرتی پھر کسی کمرے کے درودیوار کے سناٹے اس کا گلا گھونٹ دیتے۔ایک دن ابا گڑیا کی طرف سے اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے مریم کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔''یار صفدر مریم کے ساتھ کب یہ حادثہ ہوا۔ابھی تو اس کی عمر کچھ بھی نہیں۔ میری گڑیا سے چند سال ہی تو بڑی ہے۔چھوٹی سی عمر میں اتنا بڑا دکھ سچ پوچھو تو یار مریم کو دیکھ کر میں گڑیا کا دکھ بھول جاتا ہوں۔وقار کی جذباتیت کے طوفان نے میری بیٹی کی عزت کو بھی داغ دار کر ڈالا۔میں نے دبے لفظوں میں سب کو کہا تھا۔ابھی وہ پڑھ رہی ہے چھوٹی ہے۔رشتہ کی بات نہ کرو مگر یار! کبھی کبھی اپنے رشتے بھی اپنی غرض کے لئے کتنے خود غرض ہو جاتے ہیں۔سب کو پتہ تھا کہ گڑیا بہت معصوم ہے۔باقی لڑکیوں کی طرح ہوشیار نہیں ہے خوبصورت اور ذہین ہے۔سب کو اپنی خواہش عزیز تھی۔میری بیٹی کی اپنی مرضی،سوچ کی کوئی پروا نہ تھی۔مریم بیٹی کی اپنوں میں ہوئی تھی شادی یا غیروں میں؟''

بس یار! بھا جی نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔تمہیں پتہ ہے ابا جی اور اماں جی کے مرنے کے بعد بھا جی نے ہم دونوں کو پالا۔ یونیورسٹی سے مریم نے فلسفہ میں ایم اے کیا اور فرسٹ پوزیشن لی۔وہ تو ایم فل بھی کرنا چاہتی تھی مگر بھائی جی کی ایک ہی رٹ تھی۔بس بہت پڑھ لیا اب اس کی شادی ہو جانی چاہئے۔ہم نے کون سا نوکری کروانی ہے۔بس آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ساتھ والے گاؤں کے چوہدری مخدوم شاہ کے بیٹے رضا شاہ سے منگنی کر دی۔اور رخصتی سال بعد ٹھہری۔رضا شاہ اکلوتا زمینوں کا وارث ضرور تھا مگر اس کی کوئی تعلیم نہ تھی ۔بس سیّد زادہ تھا۔مریم بہت روئی مجھے کہتی لالہ! اس سے اچھا تو یہ ہے کہ مجھے زہر دے کر مار ڈالو۔مگر دادی جان کا تمہیں پتہ ہے انہوں نے ہمیشہ بھائی جی کی بات کو مقدم جانا۔مریم روئی چیخی مگر کون اس کی سنتا آخر تھک ہار کر خاموش ہو گئی۔جب تک شادی نہ ہوئی ایم فل کیا اور بس یار شادی کے سال بعد ہی رضا شاہ ایک حادثہ میں مر گیا اور اور مریم بیوگی کا داغ لئے واپس آ گئی۔دوبارہ شادی کے لئے بہت کوشش کی بس وہ مانی ہی نہیں۔جہاں اس کا دل بندھا تھا۔وہاں بی جان اور بھائی جی کی اَنا آڑے آئی۔بس اب تو میں بھی اسے زندہ لاش کی طرح پھرتے دیکھتا ہوں تو دل لرز جاتا ہے۔سب رنگوں کو خیر باد کہہ کر صرف سفید رنگ ہی پہنتی ہے۔''

دونوں دوست اب چپ بیٹھے تھے گڑیا کسی کام سے وہاں سے گزری تو آپا جی کے بارے میں سن کر اسے بہت دُکھ ہوا۔اب تو اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ آپا جی سے دل کی بہت باتیں کہے۔ان کی بھی سنے۔اس کے اندر سوالات کا جوار بھاٹا اٹھتا اور بے چین کر جاتا۔بھلا یہ بھی کوئی محبت ہوئی جو دوسرے کی زندگی کو روگ لگا جائے۔

ایک دن آپا جی نہا کر دھوپ میں بیٹھی بال سکھا رہی تھیں گڑیا پاس چلی گئی۔آپا جی نے میٹھی سی مسکان سے گڑیا کو اپنے پاس بٹھا لیا ۔''آؤ گڑیا بیٹھو ہر وقت پڑھتی رہتی ہو۔'' جی تا کہ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں اور خود پہ لگا یہ داغ دھو ڈالوں کہ میں تو وقار کی محبت سے بے خبر تھی۔میں نے اس کو نہیں مارا۔میں ڈائن نہیں میں تو کسی کو سخت بات کہہ کر رنجیدہ نہیں کر سکتی......مگر ہر وقت ممانی کے بَین میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔

آپا جی میرے ساتھ ہی کیوں ایسا ہوا......؟ میری وجہ سے ابا اپنے سب رشتے چھوڑ آئے ہیں...... میں نے ابا کا دل دکھایا...... میری وجہ سے وقار نے اپنی زندگی جو سب سے قیمتی ہوتی ہے......دے دی۔سب کچھ میری وجہ سے ہوا......گڑیا خود سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔آج آپا جی کے پاس بیٹھی تو خود پہ قابو نہ رکھ پائی اور سسک پڑی۔آپا جی نے گڑیا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔دھیرے سے بولیں ۔

''گڑیا یہ سب اس کی مرضی سے ہوا۔جو دونوں جہانوں کا مالک ہے۔وہ جو چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔تم اس ہونے سے وہ سیکھو جو وہ تمہیں سکھانا چاہتا ہے۔اس کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہے۔جس کی ہمیں سمجھ نہیں وہ تو اپنے بندے سے ستر ہزار ماؤں سے زیادہ پیار

کرتا ہے۔''

آپا جی کے سمجھانے کا انداز ہی ایسا تھا کہ گڑیا کا بے چین دل قرار پا گیا اب جو اک آگ سی دل کو جلاتی تھی وہ قدرے سرد ہو گئی۔ اب وہ بے تکلفی سے آپا جی سے باتیں کرنے لگی تھی۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے کسی بھی دکھ کا اثر آہستہ آہستہ کم ضرور ہو جاتا ہے۔ وقت اپنے ساتھ کئی پرندے ساتھ ساتھ اڑائے پھرتا ہے۔ کہیں تو یہ پرندے خوشی کے گیت گاتے ہیں تو کہیں دکھ والم کے کُرلاتے بَین ڈالتے ہیں......انسان جو خود کو بڑا طاقتور اَنا پرست، خود دار سمجھتا ہے وقت کے ایک ہی وار سے اس کی سب اَنا خودداری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

گڑیا نے شاندار نمبروں سے بی اے پاس کر لیا تو اس نے بھی فلسفہ میں ایم اے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ آپا جی نے مخالفت کی مگر اس نے کہا میں اسی میں کروں گی ورنہ نہیں پڑھوں گی۔

اب جہاں کہیں اس کا دماغ جواب دے جاتا وہاں وہ آپا جی کی طرف کتاب اٹھائے آ جاتی۔ دونوں میں ایک بے تکلفی کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ آپا جی کے پاس ایک دن ایک عورت اپنی بیٹی کو لے کر آئی کہ اس کو دورہ پڑتا ہے۔ دَم کر دیں لڑکی کا رنگ زرد، اور کمزور دکھائی دیتی تھی۔ اس کی اماں کو کمرے سے بھیج کر آپا جی نے جانے اس لڑکی سے کیا باتیں کی کہ جب وہ کمرے سے نکلی۔ ایک سرخی کی لہر چہرے پر تھی......آپا جی نے اس کی ماں سے کہا۔''جہاں یہ کہتی ہے اس کی شادی کر دو۔ ورنہ تمہاری بیٹی مر جائے گی۔''

ماں نے کہا اس نے تو کبھی نہیں بتایا۔

آپا جی بولیں۔''ایسی باتیں بیٹیاں کہتی نہیں ہوتیں۔ مائیں سمجھ جایا کرتی ہیں۔''

ماں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔''آپا جی آپ جیسی عقل ہمارے پاس کہاں؟'' یہ کہہ کر اس نے آپا جی کا ہاتھ چوما اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی۔

گڑیا بہت حیران ہوئی آپا جی کو کیسے علم ہوا سب......؟ پھر پوچھ ہی بیٹھی......آپا جی بولیں وقت اور وقت کے دیئے دکھ سب سمجھا دیتے ہیں۔ ایک رات آپا جی کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ گڑیا ان کے پاس بیٹھی سر دباتی رہی جب وہ سو گئیں تو اپنے کمرے میں آ کر کتاب کھول لی۔ کل اس کا ٹیسٹ تھا۔ رات کا تیسرا پہر تھا۔ جب گڑیا نے آپا جی کے کمرے میں نائٹ بلب کی روشنی دیکھی اس نے سوچا آپا جی ٹھیک ہوں۔ مجھے جا کر پتہ کرنا چاہئے۔ گڑیا جیسے ہی دروازہ پر پہنچی اس نے اندر آپا جی کے رونے کی آواز سنی۔ دبی دبی سی سسکیاں کمرے کے اندر دودھیا سی روشنی میں گردش کرتی ماحول کو پُراسرار سا بنا رہی تھیں۔ گڑیا کا دل تڑپ اٹھا۔ سسکیوں کی شدت بڑھ رہی تھی۔ گڑیا نے ہلکا سا دروازہ کھولا جھانکا تو آپا جی سجدہ میں تھیں اور ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔ گڑیا کو آپا جی کے اس طرح رونے سے بہت دُکھ ہو رہا تھا۔ مگر اندر جانے کی جرأت نہ ہو پا رہی تھی۔ سرخ فیتہ والی ڈائری ٹیبل پر کھلی پڑی تھی۔ سرد موسم کے آنے کا پتہ ٹھنڈے جھونکے دے رہے تھے۔ شام کو خنکی بڑھ جاتی۔ گڑیا کا ایم اے ہو چکا تھا آج کل وہ فارغ تھی۔ آپا جی کی لائبریری کی کتابیں پڑھتی رہتی۔ ایک دن اچانک ہی آپا جی کی طبیعت بگڑ گئی۔ کھانسی کا ایسا حملہ ہوا کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ گڑیا آپا جی کو سیرپ پلا کر ان کی کمر کو سہلانے لگی۔ آپا جی کی آنکھ لگ گئی۔ سرخ فیتہ والی ڈائری بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر پڑی تھی۔ گڑیا اٹھا کر دیکھنے لگی پہلے صفحہ پر 20 سال پرانی تاریخ رقم تھی۔ ایک خوبصورت نظم لکھی تھی۔

کاش تم میرے آنچل کا ستارہ ہوتے

میں آنچل کو اوڑھ کر

ستاروں کی روشنی۔اپنی آنکھوں میں بھر لیتی
جب کبھی رستہ بھول جاتی
یا میں خوش ہونا بھول جاتی
مصائب زمانہ سے تھکنے لگتی
تمھیں یاد کر کے رونے لگتی
تم اچانک آ کر میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے
روشنی بن کر مجھ سے لپٹ جاتے
میں سانس لینا بھول جاتی
کاش!تم میرے آنچل کا ستارہ ہوتے
میں رات کو سوتے ہوئے
خواب رستوں کو جاتے ہوئے
تمھیں اپنے سرہانے رکھتی
تیرا ہاتھ تھام کے......دھند میں کہیں کھو جاتی
کوئی دکھ تیرے پاس نہ آنے دیتی
کاش تم میرے آنچل کا ستارہ ہوتے
میں تمھیں اوڑھ کر سوتی
دل کے سب رنج تمھیں سناتی
تیرے شانے پہ سر رکھ کر رو دیتی
تم خوشی سے میرے دل کو بھر دیتے
جب یہ کہتے
سنو میری جان!
تم روتی ہوئی اچھی نہیں لگتی
تم پاگل سی پھر میری نہیں لگتی
کاش تم............

آپا جی کی آنکھ کھلی تو گڑیا وہ نظم پڑھ رہی تھی۔''گڑیا''انھوں نے پکارا۔

''جی آپا جی۔''

''اس ڈائری کی کہانی ختم ہونے کو ہے۔جب ختم ہو گی میرا ایک کام کرنا......''ان کا سانس پھول گیا۔وہ دم لینے کو رُکیں پھر بولی
''۔

''جس دن کہانی ختم ہو گی۔مٹی ابھی گیلی ہی ہو گی۔گلاب کی پتیوں میں بھی ابھی تر و تازگی ہو گی۔مٹی اور گلاب کی

خوشبو سے وہ شہر مہک رہا ہوگا۔ شام ہونے سے ذرا پہلے اس حویلی میں اگربتی کی خوشبو فضا کی سوگواری کو، سناٹوں کے شور کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ پرندے اپنے مسکن کی طرف لوٹنے لگیں گے۔ جب ساری حویلی کے کمروں کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کو تم ہاتھ بڑھاؤ گی۔ بڑے دروازے پر اک دستک ہوگی جیسے کوئی صدیوں بعد لوٹ آئے تو یہ ڈائری تم اسے دے دینا۔ یہ اس کی امانت ہے۔ اس کے اندر اس کی کہانی کی کہانی ہے۔''

''آپا جی آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میرا سب کچھ تو آپ ہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''تم اکثر یہ ڈائری اٹھا کر دیکھتی تھی نا۔ تو تم چاہو تو پڑھ لینا۔ مگر جب کہانی ختم ہو جائے۔''

''آپا جی پلیز! خدارا۔ میرے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔''

''گڑیا زندگی میں ہم ایسے سب رشتوں کے بغیر زندہ رہ لیتے ہیں جن کے بارے میں ہم کہتے ہیں رہ نہیں سکتے۔ پھر زندگی کے شب و روز ہمارا مذاق بھی اڑاتے ہیں کہ دیکھو تم سے وقت نے وہ چھین لیا۔ جسے تم زندگی کہتے تھے......مگر گڑیا ہم زندہ رہتے تو ہیں مگر زندہ درگور ہوتے ہیں۔ ہمارا دل رو رہا ہوتا ہے مگر ہم ہنستے ہیں۔ زندگی اور اس کے کردار سب فریب ہے۔ اس کے فریب میں آ کر دھو کہ کھا کر ہی ہم اس کو جان پاتے ہیں جو صرف اپنی پہچان کروانے کے لئے ہمیں کیسے کیسے نچاتا ہے۔ کبھی دے کر کبھی چھین کر آزماتا ہے۔ ہمارے اندر تو ہر وقت ایک ہی رقص ہوتا ہے رگ رگ میں بہنے والا خون کا ہر قطرہ یہی کہتا ہے تیرے عشق نچایا کر کے تھیا......

آپا جی کی پھر سانس اکھڑنے لگی تھی۔ اب گڑیا نے انہیں بولنے سے روکنے کے لئے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ابا اور صفدر علی شاہ صاحب نے ہر اس اچھے ڈاکٹر سے رابطہ کیا۔ جس کے ہاتھ میں شفاء کا یقین دلایا گیا۔ کسی بھی رپورٹ میں کوئی بیماری نہ تھی۔ کوئی وائرس کوئی جراثیم کی نشاندہی نہ تھی۔ آخر کیا تھا پھر آپا جی کو کیا ہو گیا تھا۔

ان کی سانس کیوں اکھڑنے لگتی۔ ان کا جسم ایسے ہو جاتا کہ جیسے خدانخواستہ......گڑیا آگے سوچ نہ سکی تھی۔ پھر ان کی باتیں بھی ایسی جو دل دہلا دینے والی......کسی انہونی کے ہونے کا ڈر ہر وقت گڑیا کے دل کو لرزا دیتا۔

تہجد کی اذان ہو رہی تھی مؤذن حی الفلاح (فلاح کی طرف آؤ) پکار رہا تھا......آپا جی نے دوپٹہ سر پر ٹھیک سے اوڑھا......''ہاں فلاح کی طرف آنے کی دعوت تو اللہ تعالیٰ ہر وقت دیتا ہے مگر کوئی آنا بھی چاہے......پھر توفیق بھی مل جاتی ہے۔ زندگی کئی سالوں کا چند لمحوں کا نام ہے۔ جب توفیق مل جاتی ہے وہی زندگی ہوتی چند لمحے ہی کیوں نہ ہوں۔ معاشرہ، اس کی روایات سب مایا جال سیدھا رستہ اپنانے میں بھی رکاوٹ کھڑی کر دیتی ہیں۔ بس پھر ڈٹ جانے کی ہدایت مل جائے۔ آپا جی نے تہجد کے نفل ادا کئے پھر دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے میرے اللہ مجھے معاف کر دے جو زندگی میں کوتاہی ہوئی میں نے زندگی بھر منافقت نہیں کی۔ تُو نے مجھے کرنے ہی نہ دی۔ میں تیرا شکر ادا کرتی ہوں......''

آپا جی ہلکے ہلکے ہولے ہولے اللہ سے کیا باتیں کر رہی تھی۔ رات کے تیسرے پہر حویلی میں سناٹوں کا راج تھا۔ صرف ایک کمرے میں ایک بندی خدا کے سامنے جھکی آنسو بہا رہی تھی۔ اس کی دبی سرگوشیوں کی آواز کمرے کے در و دیوار تک محدود تھی۔ مگر سننے والا اس کے بہت ہی پاس سُن رہا تھا۔ کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندہ کی سنتا ہے۔

آپا جی نے جائے نماز تہہ کر کے رکھی اور تسبیح پکڑ کر اپنے بیڈ پر ڈھے سی گئیں۔ کچھ دنوں سے بہت جلد تھک سی جاتیں۔ سانس اکھڑنے لگتی ذرا سا بولنے سے تکیہ سے کمر ٹکا کر بیٹھ گئیں۔ تسبیح کا دانہ گرتا اور آپا جی کے آنسو بھی ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ پھر تسبیح چھوٹ کر گری اور آپا جی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسو لڑھکے اور سفید شفون کے دوپٹہ میں جذب ہو گئے۔ چہرے پر

ایک نور آ کر چمکا۔ آپا جی کے لب مسکرائے پھر اس کمرے سے آپا جی کی روح یوں باہر نکلی جیسے کسی سے ملنے گئی ہو...... کچھ بتانے گئی ہو۔ دروازہ ہلکی سی آواز سے کھلا اور بند ہوگیا۔ جیسے کسی کی زندگی کا باب ختم ہو جائے۔

○......❖......○

وہ ایک بہت ہی خوبصورت لمبے سنہری بالوں اور خواب ناک آنکھوں والی شہزادی تھی۔ بلند و بالا پہاڑوں میں گھری وادی کے شمال میں ایک ندی بہتی تھی۔ پہاڑوں کے سینوں سے پھوٹنے والے جھرنے پتھروں سے پھسلتے مترنم گیت گاتے اس ندی میں جا گرتے ،ندی پُرسکون گیت گاتے جھرنوں کے پانی کو اپنی بانہوں میں لیتی اور بہتے پانی میں یوں چھوڑتی جیسے ماں بچے کو چوم کر گود سے اتار دیتی ہے۔شہزادی لورین اسی وادی میں پیدا ہوئی تھی۔اس کا وجود محبت کے پیکر میں ڈھلا ہوا تھا۔وفا کا مجسمہ تھی۔وہ ایک ظالم دیوتا کی قید میں تھی۔اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں ہر وقت اداسی تیرتی رہتی تھی۔اس کا جسم سوئیوں سے پرویا گیا تھا۔ظالم زیوس نے (Zeus) اسے اپنی بقائے حیات کے لئے قید کیا ہوا تھا۔زیوس کو اس کے پُرکھوں نے بتایا تھا کہ فلاں وادی میں ایک شہزادی جنم لے گی۔اس کا دل پھولوں جیسی نرمی ،اور شگفتگی رکھتا ہوگا۔اس کا خون خوشبودار اور ذائقہ میں اعلیٰ ہوگا ہر ماہ اس کے تازہ خون کا ایک پیالہ پینے سے زیوس کو ابدی زندگی ملے گی اور وہ کبھی نہیں مرے گا۔زیوس کو اسی وقت کا انتظار تھا۔وہ جیسے ہی جوان ہوئی زیوس اسے لے آیا۔ اور ایک قلعہ میں قید کر دیا۔شہزادی بچپن سے ہی اپنے ایک دوست ڈیوڈ سے محبت کرتی تھی۔اور دریا کے پار پھولوں کے جنگل میں اس سے ملنے جاتی۔اس جنگل میں تمام ایسے درخت تھے۔جن پر صرف پھول ہی اگتے تھے۔رنگ برنگے پھولوں کی یہ وادی پھولوں کی مہک سے بہت ہی دل موہ لینے والا نظارہ پیش کرتی تھی۔ڈیوڈ شہزادی لورین کو کشتی سے اترنے میں مدد دیتا۔اس کا ہاتھ پکڑ کر خوش آمدید کہتا۔دونوں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ڈیوڈ بنسری پر میٹھی دھن چھیڑتا۔شہزادی لورین سنتی رہتی پھر دونوں جنگل کی سیر کرتے۔ڈیوڈ اس کے لئے جنگلی پھولوں کا تاج تیار کرتا دونوں خوب باتیں کرتے اور ہنستے۔شام ہوتے شہزادی لورین لوٹ آتی۔

زیوس نے شہزادی کو کبھی منع نہ کیا تھا۔کیونکہ شروع شروع میں اسے ملنے سے روکا گیا تو شہزادی اپنے محبوب کی جدائی میں گھلنے لگی ۔اس کا خون بدبودار ہونے لگا۔جو زیوس کے لئے ناکارہ تھا۔پھر شہزادی نے بھی دیوتا سے کہا تم جو کہو گے میں کروں گی۔بس مجھے اس سے ملنے دیا کرو۔ورنہ میں مر جاؤں گی۔زیوس دن کو پرانی سوئیاں نکال کر نئی سوئیاں اس کے بدن میں پرو دیتا۔اس دوران شہزادی کا خون بدن سے رِسنے لگتا۔زیوس ایک پیالہ بھر کر پیتا۔پیتے ہوئے وہ شہزادی کے چہرے پر کرب کے آثار اور مسکراہٹ دیکھتا۔شہزادی لورین جس دن اپنے محبوب سے ملنے جاتی بہت خوبصورت ڈریس پہنتی اور جسم کے سارے زخم چھپا لیتی۔وہ ڈیوڈ کے کندھوں پر سر رکھ کر ایک گیت گاتی۔وہ بنسری پر میٹھی دھن چھیڑتا۔اس کا خون خوشبو سے مہک اٹھتا۔دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر رقص کرتے ۔ہلکی سی ہوا چلتی تو سارے پھول دونوں پر آ گرتے۔پرندوں کے گیتوں سے فضا گونج اٹھتی۔جیسے ہی شام رات کو گلے لگانے آگے بڑھتی وہ واپسی کی راہ لیتی چاندرات کے آنگن میں اتر آتا۔اس کی نقرئی چاندنی شہزادی کے چہرے کو چھو کر جاتی۔اور رخصت سمے جو آنسو اس آنکھوں سے بہتے۔ہوا اپنے آنچل میں سنبھال لیتی۔وہ قلعہ میں آ کر اپنا ڈریس بدلتی زخموں سے خون رِسنے لگتا۔اتنے میں زیوس اس کی خواب گاہ میں آ جاتا۔وہ سوئیاں نکالتا اور پروتا۔خوشبودار خون سے پیالہ بھر کر پیتا۔اور جھوم اٹھتا عجیب سرمستی کے عالم میں شہزادی سے پوچھتا تمہیں تکلیف تو ہوتی ہوگی۔وہ کہتی ''نہیں'' جب تم سوئیاں نکالتے اور پروتے ہو میں اپنے ڈیوڈ کی بانہوں میں ہوتی ہوں۔میری سماعت اس کی بنسری کی مُدھر لے میں مدہوش ہوتی ہے۔''

O......❖......O

مجھے اس کہانی کی کبھی سمجھ نہ آئی بھلا کوئی اتنا سنگدل کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنے مفاد کے لئے کسی ذی روح کو اذیت سے دوچار کرے یا محبت کیسے اتنی طاقتور ہوجاتی ہے۔اس کی خاطر ہر کرب سے گزرنا منظور ہوجائے۔میں بی اے کے بعد فارغ تھی۔ایم اے فلاسفی میں ایڈمشن ہو چکا تھا۔ابھی کلاسز دو ماہ بعد شروع ہونی تھیں۔جون، جولائی کی تپتی دوپہریں میں نے ناول پڑھتے گزاریں۔بی جان! سارا دن عورتوں کے مسائل سنتی اور بھا جی کی بنائی دیسی دوائیاں دیتی رہتی۔یہ سلسلہ ظہر کی اذان کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا۔بی جان اٹھتی تو ساتھ ہی مجھے نماز کے لئے تاکید کرتی، وضو کرنے چل پڑتی۔

مجھے اپنا ناول بیچ میں چھوڑ کر اٹھنا بہت ہی ناگوار گزرتا مگر بی جان کے غصہ سے بچنے کے لئے فوراً وضو کر کے نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی۔بڑے صحن سے برآمدے تک دھوپ آتی تو پنکھے بھی آگ برسانے لگتے۔ایسے میں نوراں آکر ائیر کولر چلا دیتی تو ذرا کمرے ٹھنڈے ہوجاتے۔دوپہر کا کھانا کھا کر بی جان تو سو جاتیں اور میں اپنا ادھورا ناول لے کر بیٹھ جاتی جسے میں کبھی لیٹ کر، بیٹھ کر تو کبھی پلنگ سے ٹیک لگا کر ختم کرتی۔زیادہ ہی تھک جاتی تو اوندھی لیٹ کر کہنیوں کے بل پڑھتی۔پاؤں ایک دوسرے میں پھنسا کر اوپر چھت کی طرف ہلاتی رہتی۔ایسے میں بی جان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ مجھے ڈانٹنے سے نہ چوکتیں۔''مریم یہ کیا جانوروں کی طرح لیٹی ہو۔انسانوں کی طرح بیٹھ کر پڑھو۔اور یہ تمہارا دوپٹہ کہاں ہے۔'' میں نیچے فرش پر گرے دوپٹہ کو اٹھا کر فوراً اوڑھ لیتی اور چوکڑی لگا کر بیٹھ جاتی اور کتاب گود میں رکھ کر پڑھتی۔پتہ نہیں کیوں مجھے اوندھا لیٹ کر پڑھنے میں زیادہ مزہ آتا بی جان کہتی یہ شیطانی فعل ہے اس طرح نہ لیٹا کرو۔

انسانی فطرت ہے کہ جس کام کو کرنے سے منع کیا گیا ہو وہی کرنے میں لطف محسوس کرتا ہے......شاید برائی کا راستہ اسی لئے آسان ہوتا ہے......نیکی اور اچھائی کو کرنا یا اپنانا اتنا ہی دشوار لگتا ہے۔

ستمبر کا آغاز ہوا تو یونیورسٹی میں کلاسز بھی اسٹارٹ ہوگئیں۔اماں ابا کے ایک حادثہ میں جاں بحق ہونے کے بعد بی جان نے ہم تینوں بہن بھائیوں کو پالا۔زمین ٹھیکہ پر دی ہوئی تھی۔بڑے بھائی جنہیں میں اور صفدر بھائی بھاء جی کہتے تھے۔17 سال کے تھے کہ صفدر بھائی 13 سال کے تھے اور میں 10 سال کی تھی۔بھاء جی پڑھائی چھوڑ کر زمین پر کھیتی باڑی دیکھنے لگے۔میری اور صفدر بھائی کی تعلیم جاری رہی۔ایف اے کیا تو بھاء جی نے میری شادی کا شور مچا دیا۔مگر صفدر بھائی نے کہا ابھی مریم کو پڑھنے دو۔سو بی اے کے بعد بھی یونیورسٹی میں داخلہ بہت مشکل سے ہوا۔ہر روز بھاء جی اور بی جان کو صفدر بھائی سمجھاتے اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔اسے پڑھائی کا شوق ہے۔پڑھنے دیں اچھا رشتہ ملا تو پڑھائی کے دوران ہی کر دیں گے۔سو میں نے اس دعا کے ساتھ یونیورسٹی میں قدم رکھا کہ میرا کوئی اچھا رشتہ نہ آئے۔جب تک میں پڑھائی مکمل نہ کرلوں۔بڑی سی چادر اوڑھ کر جب میں کلاس روم میں داخل ہوئی تو سب نے بڑی حیرانگی سے مجھے دیکھا لڑکیاں زیرلب مسکرائیں ان سب کے شولڈر کٹ بال ان کے ماڈرن ہونے کا ثبوت تھے۔میں دوسری رَو میں بیٹھ گئی اور اسی جگہ بیٹھے بیٹھے میں نے سب پیریڈ لئے۔تعارف ہو چکا تھا سب کو میرا نام مریم شاہ یاد ہوگیا۔اور مجھے سوائے علینہ اور عدن کے کوئی یاد نہ رہا۔

گھر آئی تو بہت تھک چکی تھی کھانا کھا کر جو سوئی تو مغرب کی اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی۔جلدی سے اٹھ کر نماز پڑھی کتابوں کو کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔پھر دوسرے دن کی تیاری کرنے لگی۔دن پَر لگا کر اُڑ گیا۔

Part 1 میں میری سیکنڈ اور عمر کی فرسٹ پوزیشن تھی۔ہم دونوں سے پارٹی کی ڈیمانڈ کی گئی میں نے کہا میں باہر نہیں جاسکتی مجھے

پرمیشن نہیں۔ میں آپ کو پیسے دے دیتی ہوں جو چاہو کھالو۔ طے پایا کہ کیمپس میں ہی فاسٹ فوڈ کا آرڈر کیا جائے وہیں کھایا جائے۔ سب گراؤنڈ میں جمع ہوئے اور خوب انجوائے کیا گیا اس پارٹی کو۔ اس دن مجھے محسوس ہوا عمر مجھے بہت گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت اچھی فیملی سے Belong کرتا تھا۔ صحت مند، چاق و چوبند، ہر وقت چہرے پر سرخی رہتی اور آنکھیں غیر معمولی ذہانت کی آئینہ دار تھیں۔ مجھے کئی بار عدن نے لیکچر کے دوران کہا تھا کہ عمر تمہیں دیکھ رہا ہے۔ مگر میں نے کبھی اس بات پہ توجہ نہ دی تھی مگر جب پارٹی کے دوران اس نے مجھے آگے بڑھ کر ہر چیز پیش کی تو مجھے بھی اس کی Extra Attachment کا احساس ہوا۔ عدن مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی مگر میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا تھا کہ یہ اچھا نہیں ہو رہا۔ بھاء جی کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ کر مجھے لرزا ہی تو گیا۔

ہماری زندگی اتفاقات سے عاری نہیں۔ اچھی بھلی پُرسکون زندگی کی روٹین کو ایک اتفاق ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ انہونی پہ یقین ہونے لگتا ہے کہ یہ بدنصیبی اور بدقسمتی کو خوش قسمتی میں بدلنے پر بھی ایسے ہی قادر ہے جیسے خوش قسمتی بدنصیبی میں بدل جائے مگر......اس ہونی اور انہونی میں سب سے زیادہ متاثر دل ہوتا ہے...... جو کچی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ جو ذرا سی بارش سے پانی کے چھڑکاؤ سے مہکنے لگتی ہے......محبت کی بارش تو ویسے ہی دل کی مٹی پر ایسی مہک، خوشبو بکھیرتی ہے کہ اس خوشبو کو ہزار ہا کوشش سے بھی روکا نہیں جا سکتا۔ ہونی کہتی یہ میں ہو کر رہوں گی......دل اور عقل کی لڑائی میں گھمسان کا رَن پڑتا ہے۔ مگر عقل ہار جاتی ہے۔ دل جیت جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محبت دو دلوں پر یکساں طاری ہوتی ہے۔ مگر انداز مختلف ہوتا ہے۔ چونکہ میں بھاء جی سے بہت ڈرتی تھی کہ انہیں ذرا سی بھی خبر ہوئی تو وہ تو مجھے مار ہی ڈالیں گے اور یونیورسٹی کے بارے میں ان کے تمام خدشات سچ ثابت ہو جائیں گے تو سادات خاندان کی کوئی لڑکی پھر یونیورسٹی کا منہ نہ دیکھ سکے گی۔

پھر میرے اور محبت کے درمیان ایک جنگ رہتی وہ مجھے اپنے حصار میں کھینچتی تو میں لڑ پڑتی اور غصہ میں اپنی چیزیں اِدھر اُدھر پٹخ دیتی۔ بی جان دیکھتی تو کہتی کیوں چیزوں پہ غصہ نکالتی ہو یہ تو بے جان ہیں۔ کسی کا غصہ کسی پہ کیوں اتارتی ہو۔ میں چونک جاتی کہیں میرے اندر کا شور باہر تو سنائی نہیں دے رہا۔ میں کہتی۔ ''یہ اپنی جگہ پہ کیوں نہیں رہتی۔ میں نے ہیئر برش دراز میں رکھا تھا باہر کس نے رکھا۔''

''بی جان ہنس دیں تم خود اپنی جگہ پہ نہیں ہو۔ انسان اس وقت فضول میں شور کرتا ہے۔ جب وہ خود اپنے دائرے سے نکل رہا ہوتا ہے مگر اسے خبر نہیں ہوتی۔''

''واقعی میں خود اپنے دائرہ سے نکل رہی تھی۔ عمر کا خیال مجھے بار بار کھینچ کر لے جاتا۔'' حتیٰ کہ ایک دن نماز پڑھتے ہوئے میں رو پڑی۔ جب میں سجدہ میں جاتی عمر کا چہرہ آنکھوں میں ہوتا۔ میں نے کئی بار نیت کر کے نماز پڑھی۔ عصر کی نماز میں نے اک گھنٹہ میں ادا کی۔ میں دعا مانگتے رو پڑی...... یا اللہ! مجھے اس محبت سے بچالے۔ میرا خاندان سماج میں اعلیٰ ہے۔ اس کے وقار، عظمت پر اگر میری وجہ سے کوئی حرف آیا تو میں خود کو معاف نہ کر پاؤں گی۔'' میں کتنی ہی دیر جائے نماز پر بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ مغرب کی اذان ہوگئی۔

دوسرے دن میں اس ارادہ کے ساتھ یونیورسٹی گئی کہ میں عمر کی طرف دیکھوں گی بھی نہیں۔ میں سارا وقت کلاس میں نظریں نیچی کئے لکھتی رہی۔ علینہ اور عدن چھٹی پر تھیں۔ میں نے فائل سنبھالی اور اٹھنے کو تھی کہ عمر میرے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

''خیریت تھی آپ کل شام کیوں روئیں؟'' میں ہکا بکا اس کی طرف دیکھنے لگی اسے اپنے اتنا قریب بیٹھا دیکھ کر تو میں مر ہی گئی۔

''آپ شاید نہیں جانتیں۔'' میں آپ کے ہر پل سے باخبر ہوں۔ کیسے ہوتا ہے یہ؟ مجھے خود نہیں پتہ بس مجھے ایسے لگتا ہے کہ میری جان نکل گئی ہے اور میں آپ کے پاس سامنے ہوں۔ کل بھی ایسا ہوا۔''

''میں...... میں نہیں روئی۔ آپ نے خواب دیکھا ہوگا۔'' میں ہوش میں آئی تو وہاں سے بھاگنے کی کی......سارا دن اسی الجھن میں رہی ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا اسے میرے دل کی کیفیت کا کیسے پتہ ہے۔
میں سیدھی لائبریری آبیٹھی۔ میرا ذہن الجھا ہوا تھا کبھی محبت میرے سامنے آکھڑی ہوتی۔ ''دیکھو میں جس دل میں اتر جاؤں وہاں سے نہیں نکلتی۔'' میں عقل کے ساتھ دل کے مقابلے پر اُتر آتی اور انجام میری بے بسی ہوتا ہے۔
پھر میں اور عقل دل اور اس کی محبت سے ہار گئے۔ مگر میں نے تہیہ کیا میں عمر کو کبھی پتہ چلنے نہیں دوں گی کہ میں بھی......
ان دنوں میں سرمستی کے عالم میں رہتی، نہ بھوک لگتی نہ نیند آتی۔ بیٹھے بیٹھے مسکرا دیتی۔ پھر انجانے سے خوف سے میرا دل لرز جاتا
۔

محبت میں سو دل کو قفل لگا لو اس کی خواہش، طلب نکل ہی آتی ہے۔ میں نے کبھی عمر کو پانے کی آرزو نہ کی تھی۔ مگر اب میرا دل چاہتا تھا اس سے ہر بات کروں اسے اپنا دل کھول کر دکھاؤں۔ میں اپنے دل کی دل میں ہی رکھتی باہر نہ آنے دیتی۔ اور خود کو سرزنش کرتی سو جاتی۔
سردیوں کا آغاز تھا اچانک ہی ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی تو سردی لگنے لگتی۔ میں بیمار ہوگئی کمزوری اور نقاہت بڑھ گئی میں یونیورسٹی جا ہی نہ پاتی۔ ایسے ہی ایک دن میں دوائی لے کر لیٹی تو میری آنکھ لگ گئی۔
''کمرے میں ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا باہر بھی ہلکی سی روشنی میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں باہر نکلی تو ایک باغ میں تھی۔ ایسی روشنی تھی جیسے ابھی صبح ہونے کو ہو۔ میں حیران سی اِدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی کہ دیکھا عمر ایک بنچ پر پھول لئے بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ آپ کے لئے لایا ہوں۔ اب آپ کیسی ہیں؟'' میری نظر پھولوں سے نہ ہٹتی تھی۔ اتنے تازہ خوبصورت گلاب کے پھول...... میں اپنا منہ پھولوں کے پاس لائی اور خوشبو اپنے اندر اتار لی۔ اور عمر کو دیکھ کر مسکرائی تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میری آنکھ کھل گئی مجھے یوں لگا سارا کمرہ خوشبو سے معطر ہے۔ شام کو تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر ویسے ہی پھول پڑے دیکھے۔ بی جان سے پوچھا ''یہ کہاں سے آئے۔'' تو بی جان بولیں تمہاری کسی سہیلی نے بھجوائے ہیں۔ چوکیدار رکھ کر گیا ہے۔ میں حیران تھی کہ میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا میں بیمار ہوں علینہ تو اپنی منگنی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ عدن بھی کسی کزن کی شادی پر اسلام آباد گئی تھی۔
میں پھولوں کو گود میں رکھ کر کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔ میں رو رہی تھی۔ میرے بال میرے چہرے پر آگرے۔ سرخ گلابوں پر میرے آنسو شبنم کی طرح چمک رہے تھے۔
محبت ہو اور پانے کی طلب نہ جاگے...... یہ کیسے ہوسکتا تھا بھلا مگر میں طلب کے پیچھے نہیں چلنا چاہتی تھی۔ میں ننگے پاؤں کیونکر یہ سفر طے کرسکتی تھی۔ مجھے تو اپنے دامن کو بچانا تھا۔ تار تار ہونے سے۔ ہم ایم اے کر کے یونیورسٹی سے فارغ ہوئے تو ٹیلی فون پر رابطہ رہا۔ کبھی کبھی عمر کا فون آتا۔ سلام و دُعا سے زیادہ بات نہ کرتا۔ اب ہمارا ایم فل کرنے کا بھی اکٹھے ارادہ تھا۔ محسوسات لمحات کئی بار ہمارے درمیان ٹھہرے اور گزر گئے۔ مگر محبت کا اظہار نہ عمر نے کیا نہ میں نے......بس اس شاہراہ پر چلتے رہے......انہی دنوں میرے رشتہ کی بات چل پڑی۔ خاندان میں ہی دور پرے کی رشتہ داری تھی ان سے۔ ایک شام وہ لوگ مجھے دیکھنے آگئے۔ میں اپنے کمرے میں ڈائری لکھ رہی تھی جب بی جان بلانے آئیں کہ بڑے کمرے میں انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے ڈائری میں لکھی نظم کی آخری لائن لکھی اور بند کر دی۔ میں سادہ سے حلیہ میں کالی شال اوڑھے صفدر بھائی کے پاس آبیٹھی۔ خواتین مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ چائے پیتے، خشک میوے

کھاتے ہوئے وہ مجھ سے بھی کوئی بات کرلیتیں۔ چچا صفدر اور آپا جی کے ساتھ پرانی باتوں کو دہرا دہرا کر ہنستے بھی رہے۔ رات کا کھانا کھا کر جب صفدر بھائی انہیں حویلی کے گیٹ تک چھوڑنے گئے تو خواتین نے کہا...... ہماری امانت کا خیال رکھنا...... میری طرف دیکھا اور مسکرائیں۔

میں اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ زمین میرے پیروں تلے پھسل رہی تھی۔ میری ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ یوں لگا میں طویل مسافت کے بعد کمرے تک پہنچی ہوں۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں دھڑام سے بیڈ پر آ گری......محبت کی خوشبو نے ابھی میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا ہی تھا۔ میں کھل کھل ہنسی ہی تھی......اب مجھے رو کر اس جذبہ سے بچھڑنا ہوگا۔ کیوں......آخر بچھڑنا میرے نصیب میں ہی کیوں......؟

سب کو سب کچھ مل جاتا ہے مجھے کچھ ملنے لگتا ہے۔ میں دامن پھیلاتی ہوں...... ہونٹوں پر خوشی کھلنے لگتی ہے اور...... پھر میں نامراد رہ جاتی ہوں...... کیوں آخر کیوں......؟

بچپن میں ابا، اماں چھین لئے...... پتہ ہی نہ چلا بچپن اور لڑکپن کیا ہوتا ہے......انگلی پکڑ کر کیسے بلندی پر چڑھا جاتا ہے، اُترا جاتا ہے۔ نہ کبھی تتلی پکڑی نہ پھول توڑا...... نہ کتابوں میں سجایا......بس پھیکا سا بچپن کوئی یاد، کوئی واقعہ بھی تو نہ تھا۔ جو میں یاد کر کے ہنستی اور ہنستی چلی جاتی۔ سنا تھا محبت نصیب والوں کو ملتی ہے۔ حکمِ خدا سے ملتی یہ وجود میں داخل ہو کر ایسا سرور بخشتی ہے کہ کائنات مہکی مہکی لگتی ہے ۔مٹی سے گندھا بدن ایسی بھینی بھینی خوشبو چھوڑتا ہے کہ رواں رواں ہوا میں تحلیل دکھائی دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب عمر سے محبت کا ادراک ہوا...... پہلی بار اس سے بات ہوئی تو میرے جسم سے ایسی سوندھی سی مہک پھوٹی تھی کہ میں حیران تھی...... یہ مہک کہاں سے پھوٹی تھی اور کیوں تھی...... مجھے ڈر تھا میں نے مانگ لیا تو پھر مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پتہ ہے کہ میں نے جو چاہا کبھی نہیں ملا۔ ہمیشہ اَن چاہا ملا...... پھر میں کیوں مانگوں......؟ میں ساری رات نہ سوئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں اندھیرے کو گھورتی رہی...... روتی رہی......مگر ایک بار بھی میں نے عمر کو پانے کی دعا نہ کی......موٴذن نے تہجد کی اذان دی......تب بھی میں نے دعا نہ مانگی...... میں جانتی تھی اس وقت تو دعا قبول ہوتی ہے......میری تو کبھی بھی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ میں اب مانگنا ہی نہ چاہتی تھی۔ شاید مجھے ڈر تھا کہیں رد نہ ہو جائے۔ ہفتہ بعد منگنی ہونا قرار پائی پھر پتہ نہیں کیا ہوا......ان لوگوں نے نکاح کرنے کا کہہ دیا۔ بھاء جی نے بھی ہاں کہنے میں دیر نہ کی۔ عورت کتنی بھی تعلیم یافتہ ہو جائے بے بس رہتی ہے۔ سماج اسے کبھی بولنے نہیں دیتا۔ دل کی بات کہنے نہیں دیتا۔

عورت جو اپنا نصیب سمجھ کر ہر بازی ہارتی چلی جاتی ہے محبت ہار کر عورت سب کچھ ہار جاتی ہے......اندر سے وہ خستہ دیوار کی طرح ڈھے جاتی ہے۔ وجود کی دراڑوں کو کبھی میک اَپ اور کبھی مسکراتے ہوئے چھپائے رکھتی ہے۔ میں بھی محبت ہار کر ڈھے سی گئی......تین دن بعد نکاح تھا۔ رضا شاہ کے نام سے وابستہ ہونے میں چند دن باقی تھے۔ مجھے لگتا تین دن بعد مجھے سولی پہ لٹکا دیا جائے گا۔ یہ خیال میری سانس کھینچ لیتا۔ میرے جسم سے خون نچڑنے لگا...... گاؤں کی لڑکیاں بالیاں سب برآمدے میں ڈھولک رکھے گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھیں۔ چچا منظور کی سیمی کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ محبت کا غرور اس کے انگ انگ سے جھلکتا......وہ محمود کی محبت کے تذکرے ہر جگہ، کھڑے، بیٹھے، چائے بناتے، کھانا بناتے کرتی......اس کی کھی کھی ہر وقت حویلی میں سنائی دیتی......اس کی آنکھیں بھی یوں مخمور سی رہتیں گویا ساری بوتل غڑاپ سے حلق سے اُتارے ہو......اس کی چٹیا بل کھاتے سانپ کی طرح کمر پر لہراتی......اس کی چال...... پازیب کی چھن چھن پر رقص کرتی مگر مجھے سیمی کے اس روپ سے سخت الجھن ہوئی شاید اس نے محبوب کو پا لیا تھا۔ اور میں کھونے چلی تھی......

اپنی کوفت اور بیزاری سے جان چھڑانے کے لئے میں نے ڈائری لکھنی شروع کی......

تیری یاد کا موسم

میرا آنچل اڑاتی ہوا سنو!
اس کو چُھو کے کہنا
تیری یاد کا موسم میرے اندر ٹھہر سا گیا ہے
وہ لمحہ جب تُو نے مجھے نظر بھر کر دیکھا تھا
میرے دل میں اتر گیا ہے
تیرے ہاتھ کا لمس
رنگِ حنا ہو کر میرے ہاتھ کو مہکا گیا ہے
تجھ سے ملنے کا ہر منظر
میری آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے
اے ہوا! اس سے کہنا
تیری محبت کا موسم...... تیری یاد بن کر
میرے دل میں بس گیا ہے
میں لکھتے لکھتے رو پڑی۔

میں کیسے عمر سے کہوں...... مجھے تم سے محبت ہے۔ تم ہی مجھے اب بچا سکتے ہو...... پھر میں کانپ اٹھتی...... بھائی جی کبھی نہیں مانیں گے...... وہ کیا سوچیں گے...... میں یونیورسٹی یہی کچھ کرنے گئی تھی...... میں کیا کروں......؟ مجھے غصہ آنے لگا...... میں کبھی خود سے لڑتی...... اللہ تعالیٰ کو تو پتہ تھا، میرے سماج کا...... میرے اونچی ناک والے خاندان کا...... پھر بھلا کیوں میرے دل میں یہ بیج بو دیا...... سیمی غریب سہی مگر کتنی خوش قسمت ہے...... اس نے محمود کو چاہا اور پالیا...... میں......؟

مجھے تو کوئی طلب دل میں رکھنی ہی نہیں چاہئے...... پلک جھپکتے دن گزر گئے۔ 31 دسمبر کو ساری حویلی روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ میرے دل پر ہنوز اندھیرے اور سناٹوں کا راج تھا۔ راہداری میں چراغ روشن تھے۔ سارنگی نواز، سُروں کی لَے میں مگن...... سیمی ماتھے پر جھومر سجائے شادی کا جوڑا پہنے ایک ایک کو بالوں میں سجے گلاب پھولوں کی داستان آنکھیں نچاتی سناتی اور ہونٹوں پر بکھری سُرخی کو بھی اس نے ٹھیک کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ہر ایک کو اپنی محبت کا یقین دلا دینا چاہتی تھی۔

حویلی کی پرانی دیواریں رنگ برنگی روشنی میں بھی عجیب پُر اسراری لگتی تھیں۔ جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو...... میرا دل لرز لرز کر تھکنے لگا تھا۔ مجھے سجا سنوار کر بٹھا دیا گیا تھا۔ ایک بار بھی تو میں نے آئینہ نہ دیکھا۔ میری نظریں بار بار حویلی کے بڑے گیٹ کی طرف اٹھتیں...... جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو...... نکاح کا شور اٹھا...... سیمی نے سب کنواری لڑکیوں کو کمرے سے نکل جانے کو کہا...... خود بڑے فخر سے میرے پاس آ کھڑی ہوئی...... بھائی جی، آپا جی اور صفدر بھائی مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوئے۔ مجھے اپنا آپ پتھر کا بنا دکھنے لگا...... مولوی صاحب نے کیا کہا کچھ سنائی نہ دیا...... بس سناٹا سا تھا۔ میری آواز ہی نہ نکلی...... سیمی نے جھک کر میرے کان میں کہا۔ ''مریم باجی جی! بولو قبول ہے'' میں چونک کر بولی ''قبول ہے'' نہ چاہتے ہوئے بھی بول دیا...... قبول ہے...... کیا ہر لڑکی کا دل

میری طرح ہی ہوتا ہے......؟ صفدر بھائی بولے۔''مریم بیٹا! یہاں دستخط کردو......میری آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں......کچھ نظر نہ آرہا تھا۔آنسو میرے گال بھگوتے لڑھکے جہاں بھائی جی نے ہاتھ رکھا تھا میں نے سائن کردیئے۔تیسری بار اپنا نام لکھتے میں کانپ اٹھی میں منہ پر ہاتھ رکھ کر سسک اٹھی۔اور یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ بی جان فکرمندسی ہوکر میری طرف آئیں...... پیچھے سے اک آواز آئی...... یہ وقت ہی ایسا ہے۔رونے دو ماں باپ نہ ہوں تو اس وقت وہ زیادہ یاد آتے ہیں۔حویلی کا بڑا دروازہ کئی بار کھلا بند ہوا مگر وہ نہ آیا......جس سے دل بندھا تھا۔اگر آ بھی جاتا تو کیا فائدہ......اب سارنگی کی آواز میں ایک تڑپ تھی...... بے قراری تھی...... یا مجھے ہی لگتی تھی۔

میرے آس پاس کئی بار رضا شاہ کا نام پکارا گیا......مگر میرا دل اس نام سے نا آشنا ہی رہا......ذرا بھی نہ دھڑکا......بس وہی عام سی دھک......دھک میرے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔اگر رضا شاہ کی جگہ عمر ہوتا تو کیا تب بھی دل اسی طور......؟

میں نے خود کو سرزنش کیا۔''تمہیں اب عمر کے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیئے......تم ایک بیاہی ہو غیر مرد کا نام لینے سے زبان ناپاک ہوتی ہے......''لیکن دل جس نام سے زندہ ہو......دھڑکتا ہو......'' دل چیخ اٹھا......میرے اندر ایک جنگ جاری تھی۔میں نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔خدانخواستہ کچھ بول نہ پڑیں۔کھانے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ جانے لگے۔سیمی نے مجھے کھانے کے لئے بہت کہا......مگر کچھ بھی نہ کھانا چاہتی تھی۔اپنے کمرے میں آ کر مجھے یوں لگا...... میں مریم شاہ نہیں کوئی اور ہوں...... میں آئینہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی...... مجھے یوں لگا......سیمی میرا مذاق اڑا رہی ہے۔اس کے قہقہے ہی نہ رُکتے، میں رو رہی تھی۔میرے رونے کی آواز اس کے قہقہوں میں دب گئی۔مجھے یوں لگ رہا تھا۔مجھے بھاری زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہے۔کسی پنجرے میں قید کر دیا گیا۔

دوسرے دن میں ابھی سو رہی تھی کہ فون کی بیل ہوئی۔فون کی بیل سے میں کانپ اٹھی...... یہ بیل عام سی نہ تھی، میں نے لرزتے ہاتھوں سے اٹھایا دوسری طرف عمر تھا۔''مریم شاہ آپ کیسی ہیں......؟ رات میں نے آپ کے متعلق بہت بُرا خواب دیکھا...... میں نے دیکھا......ایک بہت بڑا پرندہ آیا اور آپ کو اٹھا کر لے گیا...... میں نے بہت کوشش کی......مگر میں آپ کو نہ چھڑا سکا......آپ ٹھیک ہیں نا......؟''میں بمشکل بول پائی۔

''میں ٹھیک ہوں'' میں کیسے بتاتی مریم شاہ تو کل رات مر گئی......اک طوفان آیا تھا......سب کچھ ختم ہو گیا......

فون بند ہو چکا تھا۔ٹون کی آواز آرہی تھی۔

اب میرا دل ہی نہ چاہتا کہ یونیورسٹی جاؤں...... میں عمر کو اب دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔میں خود کو سمجھاتی رہتی۔دل مان جاتا مگر اگلے ہی لمحہ پھر بغاوت پر اُتر آتا۔عمر کا خیال آتے ہی میرا پسینہ چھوٹنے لگتا۔میں نے صفدر بھائی سے کہا۔

''اب میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔''

مگر صفدر بھائی بولے۔

''بیوقوف اب ایم اے مکمل کرو کبھی کبھی چلی جایا کرو میری رخصتی ایم اے کے بعد ہونا تھی۔یونیورسٹی میں کلاسز Start ہو چکی تھیں۔ایک ماہ ہونے کو تھا۔میں رات کو ارادہ باندھتی صبح ٹوٹ جاتا۔

ایک دن عدن اور علینہ آئیں اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔یونیورسٹی کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے میری ٹانگیں کانپنے لگیں...... بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔کلاس روم میں داخل ہوئی تو سامنے ہی وہ دشمن جان بیٹھا دکھائی دیا۔اس کے چہرے پر خفگی تھی۔اس نے میری طرف دیکھ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔میں نے دروازہ کا پٹ مضبوطی سے تھام

لیا۔اس کے چہرے پر حزن و ملال کے رنگ صاف دکھائی دیئے ۔ مایوسی اور ناامیدی نے اس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی ۔ میں بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی مخصوص نشست پر آ بیٹھی ۔ وہ کسی سے بات کرتے ہوئے ذرا سا مسکرایا۔ زخمی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا ساتھ نہ دیا۔ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میں چاہتی تھی اس سے کہوں مجھے دو دھاری تلوار میں پرو دیا گیا ہے...... میں اُف بھی نہیں کرسکتی...... میں اس سے دلِ بے چین کی رُوداد کہنا چاہتی تھی ۔ اسے سب بتانا چاہتی تھی کہ میرا دل تو تیری محبت سے لبریز ہے...... میں کسی بھی لمحہ تیری یاد سے غافل نہیں ۔ میں روز ارادہ باندھتی ہوں ۔ تجھے یاد نہیں کرنا مگر یہ ارادہ ہر روز ٹوٹ جاتا ہے...... سرِشام ہی مجھے یوں لگتا ہے میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے ۔ جب دل کا درد حد سے بڑھ جاتا ہے تو میں خدا کے حضور سربسجود ہو جاتی ہوں ۔ پھر رو کر اس سے حالِ دل کہتی ہوں...... میں گم صم سی بیٹھی تھی ۔ اتنے میں سر کمال کلاس روم میں داخل ہوئے ۔ ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے ۔ انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھ پر نظر پڑی تو بولے ۔

''Wellcome To Back مس شاہ! آپ کیسی ہیں مبارک ہو۔ کب پیا دیس سدھار رہی ہیں......؟''

میرے لئے دو گھڑی کھڑا ہونا مشکل ہو گیا...... میں صرف اتنا ہی کہہ پائی ۔ ''شکریہ سر'' اور بیٹھنے کی کی ۔

''بھئی آپ تو بجائے فریش ہونے کے بہت کمزور لگ رہی ہیں ۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے......؟'' وہ پھر بولے ۔

میں نے صرف سر کے اشارے سے کہا۔

''جی سر''

لیکچر شروع ہو گیا۔ عمر سر جھکائے مسلسل لکھ رہا تھا۔ مجھے سر کی صرف آواز آ رہی تھی...... کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی...... عمر کو دیکھ کر میرا دل بے قابو ہو رہا تھا...... غصہ آتا تو میرا دل چاہتا...... عمر کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دوں...... دل سچ بول کے مجھے رُلا دیتا۔ آنسو میرے آنکھوں سے بہنے کو بے تاب تھے...... میں نے سوچ لیا...... میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی ۔ یہ سوچ کر میں نے ذرا دل کو بہلایا۔

میں سارا دن کھوئی کھوئی سی رہی...... دل میں چھپی خلش کسی کانٹے کی طرح مجھے بے چین کئے رہی...... کبھی کبھی پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے ۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں ۔ ادراک ہو جانے پر اسی سے Avoide کرتے ہیں...... اسے دیکھنا بھی چاہتے ہیں...... مگر دور ہونا بھی چاہتے ہیں...... دور جا کر بھی بے قراری کم نہیں ہوتی...... بڑھتی ہی جاتی ہے ۔ یہ وہ آگ ہے جو نہ جلاتی ہے نہ بھسم کرتی ہے ۔ بس سلگتی رہتی ہے...... دھیمی دھیمی سی یہ آگ نہ جینے دیتی ہے ۔ نہ مرنے دیتی ہے...... زندگی کے آخری کونے پر کھڑا کر کے مرنے کی آرزو پیدا کرتی ہے...... اندر سے کہیں سے آواز آتی ہے...... تم تو پہلے ہی مر گئی ہو...... تم کہاں زندہ ہو......؟ آخری پیریڈ لے کر میں نے واپسی کی ٹھانی اور کبھی نہ آنے کا ارادہ کر کے میں گھر لوٹ آئی......

O......❖......O

اپنے کمرے میں Books اور بیگ رکھ کر میں واش روم میں گھس گئی...... دیوار سے ٹیک لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی...... میں دل میں لگی آگ کو آج اپنے آنسوؤں سے بجھانا چاہتی تھی ۔ میں بلک بلک کر روئی...... اپنے چہرے کو ٹھنڈے پانی سے صاف کرتی پھر روتی...... رو رو کر میری آنکھیں جل اٹھیں ۔ مگر میرا دل تھا کہ چیختا ہی چلا جا رہا تھا......

میں نے روتے روتے سوچا...... عمر سے کہہ دوں...... کہیں دور چلا جائے...... مجھے کبھی نہ دکھائی دے...... مگر پھر سوچتی...... مجھے کیا حق ہے...... کہ میں اس سے یہ کہوں...... میں کیوں نہ...... اس سے آگے میری سوچ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

کبھی میرا دل چاہتا میں اس سے خوب باتیں کروں...... میں بولتی جاؤں...... وہ سنتا جائے...... وقت رک جائے...... مگر میری

باتیں نہ ختم ہوں کبھی نہ......

پھر اس سے باتیں کرتے کبھی میں خوب ہنستی اور کبھی خوب روتی...... مجھے اُسے چھوڑنا ہے۔ ہمیشہ کے لئے کبھی نہیں ملنا......

مجھے غصہ آنے لگا...... کیوں مجھ سے ہی کیوں چھینا جاتا ہے...... میں ہی کیوں قربانی دوں......؟

ایک بار پھر میں بلک اٹھی...... پتہ نہیں کیوں میرے دل کو صبر نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ ماننے کو ہی تیار نہیں تھا۔ اب مجھے عمر سے کبھی نہیں ملنا...... یہ بات میرے دل کو چیر کر رکھ دیتی۔ میں نے کئی بار پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی...... مگر بے سود...... بس مجھے ایک ہی پچھتاوا تھا ہمیں کیوں ادراک ہوا محبت کا...... ہم ایک دوسرے سے انجان ہی رہتے اور اندر ہی اندر محبت بھی کرتے......

مگر محبت تو ایسی بوٹی ہے جس من میں مہکے پھر کب چھپی رہتی ہے۔ خوشبو بھی بس اس وقت تک پھول میں قید رہتی ہے۔ جب خود سے بے خبر ہوتی ہے۔ جیسے ہی پھول کھل کر باہر نکلنے کا در وا کرتا ہے خوشبو آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ اڑتی پھرتی ہے۔ ہر کوئی خوشبو کو محسوس کرتا ہے...... دکھائی کسی کو نہیں دیتی...... بس اپنے ہونے کو محسوس کراتی ہے۔

کیا اللہ کی مرضی کے بغیر خوشبو ایسا کر سکتی تھی...... ''نہیں'' میرے دل نے جواب دیا۔

میرے دل میں عمر کی محبت میری مرضی سے نہیں۔ اللہ کی مرضی سے پیدا ہوئی...... دل پر اس کے سوا کسی کو اختیار نہیں......

یہ خیال ایک روشنی بن کر دل میں اترتا چلا گیا...... طمانیت کا احساس ہوا......

پھر دل بے قرار ہوا...... یا اللہ کچھ تو وقت مل جاتا...... وہ کچھ تو کہتا چند جملے...... باتیں......

میں ان کو یاد کرتے زندگی کے کچھ لمحے تو اپنی مرضی سے بتاتی، میں زندگی کو جی لیتی......

اس دوپہر میں روتے روتے سوگئی۔ آنکھوں کی چبھن ہنوز برقرار تھی۔ کاش میں کبھی نہ اٹھتی...... یوں ہی سوئی رہوں...... کوئی نہ مجھے جگائے...... زندگی کا کوئی رنگ مجھے اچھا نہ لگتا...... میرا دل عمر کے نام کی مالا جپتا رہتا......

ندی کا چمک دار پانی تھا یا آئینہ۔ کناروں پر اُگی ہوئی نئے درختوں کی شاخیں جھک جھک کر پانی کو چھو رہی تھیں، سبک روی سے چلتی ہوا...... انہیں ساتھ لے کر محورقص تھی۔ میں ندی کے کنارے بیٹھی رو رہی تھی...... میں نے اپنے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کئے جہاں آنسو کا کھارا پانی لگا۔ میرے دوپٹے کا رنگ ہی بدل گیا۔ میں بہت حیران ہوئی۔ دوپٹے کو پکڑے سوچ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوا......؟ مجھے دور سے عمر آتا دکھائی دیا۔ وہ مسکراتا ہوا...... میرے پاس آ بیٹھا۔ میرا دل مسرور ہو گیا اسے پاس دیکھ کر میں بھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے دیکھا میرا دوپٹہ بہت خوبصورت رنگوں میں رنگ گیا تھا۔ ایک خوشبو میرے چارسُو بکھر گئی...... بہت انوکھی خوشبو تھی۔

وہ ایک شاخ کو پکڑ کر پانی میں ڈال کر پانی کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''مریم شاہ! دنیا کے کسی بھی کونے میں رہو...... میں تم کو دیکھ سکتا ہوں...... جس دن مجھے تم سے محبت کا ادراک ہوا تھا...... خدا سے دعا مانگی تھی۔ مریم کو بھی مجھ سے محبت ہو جائے...... میں اُسے تم سے نہیں مانگوں گا...... بس یہ التجا ہے کہ وہ کہیں بھی رہے...... میرا دل اس سے واقف رہے۔ انجان نہ رہے۔

مریم شاہ! آپ اعلیٰ حسب ونسب رکھتی ہیں میں آپ سے محبت تو کر سکتا ہوں...... پانے کی تمنا نہیں...... ہم تو ازل سے سادات کے غلام رہے ہیں...... میں اپنے گستاخ دل کو آپ سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکا...... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا...... میں آپ سے بہت دور جانے کی کوشش کروں گا...... بہت دور...... اتنا دور کہ کبھی آپ کو نہ دیکھ سکوں...... نہ ملوں...... مگر دل سے دور نہیں۔ ہاں

کبھی قسمت نے ساتھ دیا اور آپ نے بلایا تو ضرور آؤں گا......مگر مجھے لگتا ہے کہ شاید......اس وقت سب بدل جائے گا...... ہمارے دل نہیں...... میں آپ کا قصوروار ہوں......میری وجہ سے آپ...... میں نظریں جھکائے سنتی رہی......کچھ نہ بول سکی۔ کچھ کہنے کے لئے لب کھولے سر اٹھا کے عمر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی...... وہ کہیں نہیں تھا۔ پانی میں میرا عکس میرے دل کی طرح ہچکولے کھانے لگا...... میں نے سامنے بیٹھے دو پرندوں کو دیکھا۔ دونوں چونچ سے چونچ ملائے بیٹھے تھے۔ مادہ نے ایک ادا سے پَر پھیلائے اور اڑ کر درخت کی شاخ پر آ بیٹھی۔ نر پرندہ بھی اُڑ کر چہکتا ہوا اس کے پاس جا بیٹھا۔ مادہ بہت خوبصورت سی آواز میں چہکی پھر دونوں چہکتے ہوئے دور اُڑتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میرے دل نے خواہش کی۔

پرندے

کاش ہم تم بھی پرندے ہوتے
ایک ڈال سے دوسری
اڑتے پھرتے
چہکتے اور گاتے
دنیا سے بہت دور
محبت کے سفر پر گامزن رہتے
بادلوں کو چُھو کر پہاڑوں کے دامن پہ اترتے
کھلتے پھولوں سے تتلیوں سے کھیلتے
کبھی مخملیں گھاس کے سمندر پر
پیلے پھولوں کے جزیرہ پہ اترتے
محبت کے گیت گاتے
اَزل سے اَبد تلک
جذبۂ عشق سے سرشار بس یہ کہتے
محبت میں ہوں......
محبت تم ہو......
اور کچھ نہیں
باقی سب مایا جال ہے
محبت میں ہوں......
محبت تم ہو......

مجھے اپنا وجود فضا میں تحلیل ہوتا۔ آسمانوں میں گم ہوتا دکھائی دیا......میرا دل اب سرشاری کی کیفیت میں تھا۔
اچانک میری آنکھ کھلی...... میرا تکیہ بھیگ چکا تھا۔ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھا تو آنگن میں اتری شام اب رات میں ڈھلنے کو تھی......مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ میں تیزی سے اٹھی۔ وضو کیا...... جائے نماز پر کھڑی ہو کر مالک کے سامنے اس کی رضا کے لئے

جھک گئی......دل کواللہ کی رضا میں راضی ہونے پرآمادہ کیا۔دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اپنی بے بسی کا احساس ہوا......میں تو عمر کو دعا میں بھی مانگ نہیں سکتی تھی۔آنے والے طوفان سے ڈر لگتا تھا۔میں نے روتے ہوئے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لئے اور سسک سسک کر روئی۔

''مریم بیٹی!نہ رو۔ایک بار خدا کی رضا میں راضی ہو کر تو دیکھو......وہ تجھے کیسے نوازتا ہے۔''دل نے کہا۔''اَن چاہے من سے؟''

آواز آئی۔''ہاں اَن چاہے من سے بھی۔''

یہاں کون اپنی مرضی کا مالک ہے......انسان اپنی مرضی سے مذہب اختیار نہیں کرتا......مسلمان کا بچہ مسلمان کہلائے گا۔عیسائی کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ عیسائی......گلاب کے پھول سے چنبیلی کی خوشبو نہیں آتی......ایک ہی مٹی میں کھلنے والے پھول خوشبو ایک جیسی نہیں رکھتے۔

فطرت اپنی جگہ پر قائم ہے۔بس خدا کی رضا ہونا بڑی بات ہے۔

جو یہ سیکھ جاتے ہیں......وہ من کے دریا کے اس پار اتر جاتے ہیں۔جہاں سے بقاء کا سفر شروع ہوتا ہے۔من کی دنیا میں اس پار اترنے کی خواہش رکھنی چاہئے۔

''چھوٹے چھوٹے طوفان زندگی کے سمندر میں آتے رہتے ہیں۔مقصد زندگی کے ان طوفانوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس پار جا کر بقا پانا ہے۔

چل اٹھ میری دھی!اس طوفان سے نکلے گی تو اگلا سفر شروع ہوگا۔''

میں چونک گئی۔آواز کہاں سے آئی تھی۔آواز جانی پہچانی تھی۔سمجھ نہ پائی کس کی آواز تھی۔بہرحال اتنا ہوا کہ جب منہ پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز تہہ کیا تو میرے دل میں سکون واطمینان اُتر آیا۔

اگلے دن میں نے فیصلہ کیا اب کبھی عمر سے نہیں ملوں گی۔اس کا سامنا نہیں کروں گی۔شام کو عدن کا فون آیا......عمر کا فون آیا تھا۔وہ چلا گیا وہ کہہ رہا تھا۔

''مریم شاہ کو سلام کہنا اور کہنا۔مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔اب آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گی۔میں اتنی بڑی دنیا میں خود کو گم کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں بالکل بھی نہیں روئی مجھے حیرت ہوئی خاموشی سے فون رکھ دیا۔

میں نے پرائیویٹ امتحان دیا۔اور پہلے نمبر پر تھی عمر مدِمقابل ہوتا تو میں کبھی پہلے نمبر پر نہ آتی۔رزلٹ کے دو ہفتوں بعد ہی میری رخصتی کا پروگرام بن گیا۔

میں بھاری سرخ کامدار جوڑا پہنے تھی جب بیوٹیشن نے میری کشادہ روشن پیشانی پر چھوٹے چھوٹے ہیروں کے درمیان بڑے سرخ نگینہ سے سجی بندیا ٹکائی تو سب کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔

میرا اُداس روپ دیکھ کر ہر کسی نے تعریف کی۔میری سہیلیوں کا کہنا تھا مریم شاہ تمہاری گردن سے روشنی پھوٹتی ہے۔تمہارے چہرے پر اتنا بھولپن ہے کہ نظر نہیں ہٹتی۔تمہاری سادگی میں بھی حسن ہے۔میں مسکرا دیتی۔

میں بھاری بھرکم جوڑا پہنے بیٹھی تھی۔میرے آس پاس سب میرے اپنے تھے۔بچوں کی مائیں اپنے بچوں کو کارنامے سنا رہی تھیں۔لڑکیاں،بالیاں بے فکری سے قہقہے لگا کر ہنستیں تو ان کی ماؤں کے دل انہیں خوش دیکھ کر اطمینان سے مسکرا دیتے۔ہر طرف رنگ ہی رنگ،خوشیوں سے بھرپور چہرے۔

مجھے تو قہقہہ لگائے بھی مدت ہوگئی تھی۔ایک بار میں کسی بات پر بہت ہنسی۔میری ہنسی کی آواز سن کر عمر جو ہمارے پیچھے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا اس نے چونک کر سر اٹھایا۔اتنے میں انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی CR جاتی جاتی پلٹی اور میرے پاس آ کر بولی۔''مریم شاہ تمہاری ہنسی کی آواز تو جلترنگ بجاتی ہے۔یقین کرو۔''Wonderfull''

وہ کہہ کر واپس پلٹی تو میں نے عمر کو بھی مسکراتے ہوئے دیکھا۔

اب تو...... مجھے ہنسی ہی نہ آتی۔شاید میں بھول گئی تھی ہنسنا۔

جونہی بیٹھے بیٹھے میرا دھیان اپنے کمرے کی طرف گیا آج اس کمرے میں خاموشی سوئے گی۔

میں کہاں جارہی ہوں......؟ اور کیوں......؟ کیا میں خوش رہوں گی......اور وہ بھی رضا شاہ کے ساتھ...... میں نے تو ایک دن بھی اس کے بارے میں نہ سوچا......اب اور آج رات...... میں کیا کروں یا اللہ! میری مدد کر۔

رضا شاہ کے ساتھ میری زندگی کیسی ہوگی......؟ کیا میں زندہ ہوں...... میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں۔میں نے اپنے بازوؤں میں چوڑیاں دیکھتے ہوئے سوچا۔

مجھے یوں لگا میرے بازوؤں میں چوڑیاں نہیں ہتھکڑیاں ہیں۔میں سرتاپا کانپ گئی۔میرا جی چاہا ساری چوڑیاں اتار پھینکوں کہیں دور بھاگ جاؤں اور بھاگتی چلی جاؤں۔

یا پھر میں آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاؤں میں بہت عجیب انداز میں سوچ رہی تھی۔رخصتی کا شور اٹھا۔مجھے قرآن پاک کی چھاؤں میں سرخ گلاب سے سجی بلیک کرولا میں بٹھا دیا گیا۔

''کیا قرآن پاک اسی مقصد کے لئے اتارا گیا تھا......اس کی تعلیمات کو تو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا......کیا اس مقدس کتاب میں ذات برادری،نسل ورنگ،حسب نسب کے امتیاز کو اہمیت دی گئی ہے۔کیا ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔اور کمروں کے ایک کونے میں پڑی یہ کتاب صرف غلاف میں سجا کر رکھنے کے لئے ہے......؟ یا زندگی گزارتے ہوئے اس سے ہدایت لینی چاہئے۔''

گاڑی ایک جھٹکے سے''سادات''حویلی کے سامنے رکی تو میں اپنے خیالوں سے چونکی۔حویلی کے بڑے گیٹ سے داخلی دروازے تک پھولوں کی پتیوں کا کارپٹ بچھا تھا میں پاؤں رکھتی تو پھولوں میں میرا پاؤں دھنس جاتا۔رضا شاہ کی بھابیاں اور بہن مجھے سہارا دے کر حجلۂ عروسی تک لائیں۔کمرے میں گلاب کی مہک اور ٹھنڈک نے خنکی پیدا کر رکھی تھی۔مجھے جھرجھری سی آئی بیڈ پہ بھی بے تحاشا پھول تھے۔پھولوں کی نمی سے کمرے میں ٹھنڈک تھی۔یہ سب مجھے اک خواب لگ رہا تھا۔بہت دیر تک رسمیں اور تصویریں بنتی رہیں۔بیٹھ بیٹھ کر میری کمر بُری طرح دُکھنے لگی تھی۔ہر کوئی میرے پُرسوز روپ کو دیکھ کر تعریفی جملے کہہ کر جاتی۔ماشاءاللہ،چشم بددور......

مجھے اپنا کمرہ بہت یاد آرہا تھا۔یہاں مجھے اجنبیت محسوس ہورہی تھی۔رات کے بارہ بج چکے تھے۔سب خواتین ایک دوسرے کو یہ کہتی ہوئیں کمرے سے نکل گئیں۔

''اب مریم کو آرام کرنے دو۔''

ایک ہنس کر بولی۔

''آرام اور اب......؟''

پھر سب کھلکھلا کر ہنسیں۔

دروازہ بند ہو گیا۔تو میں سر اٹھا کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔سر جھکا کر بیٹھنے سے میری گردن تھک گئی تھی۔میں نے بیڈ سے ٹیک لگالی۔سوچ پھر میرے اندر آ کر بولی۔

''کیا ہر لڑکی میری طرح ہی سوچتی ہے...... یا سیمی کی طرح چہکتی پھرتی ہے......''

میری نظروں کے سامنے سیمی کا مسکراتا چہرہ آ گیا۔وہ اب زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔امید سے تھی۔آنے والی خوشی کے انتظار میں اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

اتنے میں باہر سے کھسہ کی چرر چرر سنائی دی۔دروازہ کھلا آواز اندر آ گئی۔رضا شاہ جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا مگر زمین، جائیداد کا مالک تھا۔دو بھائی امریکہ تھے۔رضا شاہ نے شروع سے ہی زمینیں سنبھالیں۔ابا جی کے ساتھ ڈیرہ پر زمین کے جھگڑے نپٹانے میں لگا رہتا۔پھر ابا جی کے بعد سب معاملات خود ہی دیکھتا۔اماں جی کو افسوس رہتا رضا شاہ کی تعلیم ادھوری چھوڑنے پر۔

''وہ کہتا اماں پھر زمینوں کو کون دیکھے گا......؟''اماں دنیا سے چل بسی تو رضا شاہ شترِ بے مہار ہو گیا۔آس پاس مطلب پرست لوگ جمع تھے۔وہ خوشامد سے دماغ خراب کر دیتے۔ایسے ہی دوست احباب کے ساتھ رہتے ہوئے رضا شاہ کو پینے کی عادت پڑ گئی۔وہ جب کمرے میں داخل ہوا پیئے ہوئے تھا۔

''مریم شاہ! سنا ہے تم بہت خوبصورت ہو۔پڑھی لکھی بھی ہو......لیکن تمہاری پڑھائی کا مجھ پر رعب نہیں پڑنے کا۔''

یہ کہہ کر اس نے مریم کا ہاتھ پکڑا اور ہیرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈال دی،اس کا ہاتھ جگمگا اٹھا۔

''کاش میری قسمت بھی ایسے ہی جگمگانے والی ہوتی......مردہ دل کے ساتھ جینا کتنا مشکل ہے۔کسی کی خواہش پر اپنی خواہش کو قربان کرنا......اس بار بار مرنے سے تو ایک بار مر جانا بہتر ہے۔''

آج مریم کو پھولوں سے سجی خواب گاہ میں شہزادی لورین کی کہانی سمجھ آئی۔رضا شاہ اسے ظالم زیوس لگتا تھا۔

صبح کے تین بج رہے تھے۔میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ابھی ابھی سولی سے اتارا گیا تھا۔میں زخمی دل سے پھولوں کی لڑیوں کو پکڑ پکڑ خود کو باور کراتی رہی یہ سب حقیقت ہے خواب نہیں۔آج مجھے شہزادی لورین کی اذیت محسوس ہوئی۔گرم گرم دو آنسو میری آنکھوں سے لڑھکے۔یہ سوچ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

○......❖......○

''عمر جانے کہاں ہوگا......وہ سرزمین کیسی ہوگی جہاں تم سانس لیتے ہو......؟ کیا وہاں بھی مٹی کا رنگ ایسا ہے......کیا بارش ہونے کے بعد مٹی مہکتی ہے......

کیا آنکھوں کا کھارا پانی......تمہاری آنکھوں سے بھی بہتا ہے۔جب تم مجھے یاد کرتے ہو۔

رضا شاہ نے سوئے ہوئے اپنا بازو میری کمر پر رکھا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔

میں نے رضا شاہ کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''کاش رضا شاہ کی جگہ تم ہوتے......مگر تم ہوتے تب نا......؟''

سوچ نے مجھے سرزنش کیا۔

''تم بیاہی ہو......اب ایسا نہ سوچو۔''

اس سرزنش نے میرے اندر جنم لیتے پچھتاوے کو ہڑپ کر لیا۔

دور کہیں سے مؤذن اذان دینے لگا۔

''اللہ اکبر......اللہ اکبر۔''

''اللہ بہت بڑا ہے۔اللہ بہت بڑا ہے۔''

اللہ کے گھر کی داسی بن کر دہلیز پر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔خود کو اللہ کے گھر کی داسی بنا کر بیٹھ گئی۔دعا مانگی۔

''یا اللہ میری مدد کر دے۔مجھے اپنی رضا میں راضی کر دے......میرے دل پر تُو قابض ہو جا......باقی میں سب بھول جاؤں......صرف تیرا نام یاد رہے۔''

جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری زندگی بھی بدلتے موسموں کی طرح بدلتی چلی گئی۔

پانچ سال یوں گزرے......کہ میں روز سرِشام ہی سولی پہ لٹک جاتی......مر جاتی......صبح ہوتے ہی سورج کی کرن میری نئی زندگی کا پیغام ہوتی۔

رضا شاہ کا دل میں جیت نہ پائی۔وہ کہتا تھا مجھ میں ''عورتوں جیسی کوئی بات نہیں......مجھے چھولو یا پتھر کو چھولو......تم موم کی طرح پگھلتی نہیں۔پتھر جیسی جامد،ساکت......خاموش ہو تمہیں دل لبھانا نہیں آتا......نہ پگھلتی ہو نہ پگھلاتی ہو......تمہیں تو ہنسنا بھی نہیں آتا۔تمہاری چوڑیوں کی جلترنگ بھی روتی ہوئی لگتی ہے......تم میں کوئی خوبصورتی نہیں......نہ خوشبو ہے۔نہ تم میری راحت کا باعث ہو......''

میں چپ اس کے یہ سب الزامات سنتی۔اس کی مرضی سولی پر خوشی خوشی قربان کرتی......مگر......بے سود۔

مجھے چوڑیاں پسند نہ تھیں۔مگر اس کے آنے سے پہلے پہن لیتی......لوگ کہتے۔

''مجھے کسی آرائش کی ضرورت نہیں۔''

وہ کہتا۔''تمہیں سنورنا نہیں آتا پھیکا ہے تمہارا روپ۔''

ان پانچ سالوں میں،مَیں نے خود کو بہت بدلا......مگر ایک رضا شاہ کا دل نہ جیت سکی۔حالانکہ میری روح ہلکان ہو گئی......اللہ نے میری گود بھی خالی رکھی میں یہی سوچتی......شاید میں اس قابل نہیں مالک کی مرضی......

میں ہر روز شام نہ ہونے کی دعا کرتی۔اور روز ہی میری دعا رَد ہو جاتی۔مجھے اب دعا کی قبولیت پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔

میں ہر روز شہزادی لورین بن جاتی۔مگر وہ تو کبھی کبھی اپنے محبوب سے مل کر دل کا حال سناتی......میں تو سب دل میں چھپائے رہتی۔

آپا جی جب تک زندہ رہیں......ملنے آتیں اور نہ آنے کا گلہ کرتیں۔یہ بھی کہتیں۔

''مریم خوش خوش رہا کرو......ہنسا کرو۔''

میں پھیکی سی ہنسی ہنستی اور کہتی۔

''آپا جی ہنستی تو ہوں......بہت خوش ہوں۔''

آپا جی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتیں۔

''کچھ باتیں کہنے کی نہیں۔محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔تم کچھ کہتی نہیں ہو......تو کیا میں محسوس نہیں کر سکتی......نصیب لڑ کر حاصل ہوتا ہو تو لڑ بھی لیتے۔''

آپا جی دعا دیتے ہوئے جاتیں۔

''سدا سہاگن رہو۔''

مگر آپا جی کی دعا قبولیت نہ پا سکی......

ایک دن رضا شاہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ ملتان گیا۔ دوستوں نے پی رکھی تھی، غل غپاڑہ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے گاڑی ٹکرائی اور موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

میں عصر کی نماز کے بعد چوڑیاں پہن رہی تھی۔ ابھی ایک بازو میں پہنی تھیں...... کہ حویلی کا گیٹ کسی نے زور سے بجایا مکین دہل گئے......

چڑیاں درختوں سے اُڑ گئیں۔ ایک کہرام مچ گیا...... اس دن شام کے بعد رات آئی مگر پانچ سالوں کی سب سے مختلف رات...... نہ مجھے کسی نے جھڑکا۔ نہ کسی نے کوئی الزام لگایا۔ نہ کوئی تھپڑ رسید کیا نہ مجھے پتھر ہونے کا خطاب ملا۔

ہر کوئی رویا...... میں تو پانچ سال سے رو رہی تھی۔ مگر آج آنسو پتہ نہیں کہاں چھپ گئے۔

میں بس رضا شاہ کے چہرے کو تک رہی تھی...... سرخ و سپید چہرہ پر گھنی مونچھیں...... شراب پینے سے اس کی آنکھیں سرخ رہتی تھیں۔ آج آنکھیں بند تھیں تو چہرہ معصوم سا لگا...... کسی نے میری چوڑیاں اتار دیں...... تو مجھے بہت عجیب سا لگا خوف بھی آیا...... ایک لمحہ کو خیال آیا رضا شاہ ڈانٹ دے گا...... اس کی طرف دیکھا تو پتہ چلا...... موت کتنی خاموشی سے آتی ہے۔ اور فوں فاں کرنے والے کو بھی خاموش کر دیتی ہے۔

رضا شاہ کے مرنے کے بعد میری عدت کی وجہ سے آپا جی روز چکر لگا لیتیں۔ اب جاتے ہوئے کوئی دعائیہ جملہ نہ کہتیں بس خاموشی سے میرا چہرہ تکا کرتیں۔

رضا شاہ کے چالیسویں کے اگلے دن صبح تین بجے آپا جی کو ہارٹ اٹیک ہوا اور چل بسیں۔

آپا جی کی میت اس آنگن میں جہاں میں کھیلتی تھی، بھاگتی پھرتی تھی، رکھی ہوئی تھی۔

آپا جی کا پُر نور چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میں بلک بلک کر روئی۔ میرا دکھ سمجھنے والی، قدم قدم پر خیال رکھنے والی آپا جی جس نے ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ آج مجھے تن تنہا چھوڑ گئی۔ گھر حویلی کے در و دیوار چپ چاپ رو رہے تھے۔ اس رات آپا جی کی میت اٹھائی گئی تو ہلکی سی بارش برسی۔ گویا کہ رات روئی ہو۔ مٹی کی مہک نے سارے آنگن کو مہکا دیا۔

آپا جی کے مرنے پر میں آئی تو واپس سادات حویلی پلٹ کر نہ گئی۔ حویلی میں سناٹا راج کرتا...... آپا جی سے جو عورتیں دم کروانے آتی تھیں اب مجھ سے کہتیں...... میں کہتی میرے دم میں کہاں شفاء......

ایک دن سیمی اپنے بچوں کے ساتھ آئی اس کا چھوٹا گود کا بچہ بہت رو رہا تھا...... کسی طرح بھی چپ نہ ہو رہا تھا۔ وہ زبردستی کہنے لگی۔ مریم باجی آپ اللہ اور اس کے سوہنے محبوب کا نام لے کر اس پہ دم کر دیں۔ مجھے یقین ہے آپ کے دم میں شفاء ہے۔

میں نے آپا جی کی بتائی ہوئی آیات پڑھ کر پھونک دیا۔ بچہ چپ ماں کی گود میں سو گیا...... اس نے اس بات کا چرچا کر دیا پھر تو یہ سلسلہ چل پڑا۔ میں صبح سے شام تک عورتوں کے مسائل سنتی۔ یہ سچ ہے کہ دوسروں کے دکھ سن کر انسان اپنے بھول جاتا ہے۔ میں ہر روز عجیب عجیب کہانیاں سنتی۔ کہیں عورت مظلوم تو کبھی مرد۔ میں بھی رضا شاہ کے ساتھ گزارے ناخوشگوار سال آہستہ آہستہ بھولنے لگی۔

بس بھولی نہ تو عمر کو۔ کہیں پڑھا تھا محبت کی انتہا یہ ہے کہ چاہنے والوں کو دعا میں یاد رکھا جائے۔ میں بھی اپنی ہر دعا میں اسے یاد

رکھتی ۔ بھاء جی اور صفدر بھائی نے شروع شروع میں بہت کوشش کی میری دوسری شادی کے لئے مگر میں نہ مانی ۔آخرکار انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں اکثر عمر کو خواب میں دیکھتی ۔ وہ کچھ نہ کہتا بس دیکھتا رہتا۔اور پھر چپکے سے واپس جدھر سے آتا چلا جاتا ۔ میں جب بھی اسے خواب میں دیکھتی ۔ رات کا تیسرا پہر ہوتا۔ میں اب رات کے تیسرے پہر جاگتی اور نفل نماز پڑھتی ۔کئی کئی گھنٹے میں جائے نماز پر بیٹھی رہتی ۔ روتی رہتی ۔ میں آزمائش کے مرحلہ سے گزر رہی تھی ۔عمر کا میری زندگی میں آنا ایک کڑی آزمائش تھی ۔ میں جتنا اس کو بھولنے کی کوشش کرتی ۔ وہ یاد آتا ۔ مجھے یوں لگتا میں اسے یاد کر کے خدا کی یاد سے غافل ہو رہی ہوں جب یہ احساس جاگتا ۔ میں اپنی عبادت میں اور بھی محو ہو جاتی دلوں پر اختیار تو مالک کو ہے ۔اس کی مرضی جب چاہے ملا دے اور جب چاہے الگ کر دے ۔ مجھے اپنے رب کے اختیار کا علم تھا۔

عصر کی نماز کے بعد ذکر کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی ۔ میں نے دیکھا کہ بہت بلند و بالا عمارت کے اندر ہوں ۔ سیڑھیاں چڑھتی جاتی ہوں...... بہت سی سیڑھیوں کے بعد ایک برآمدے کے نکڑ پر میں کھڑی ہوں ۔ بادل بہت قریب ہیں ۔اتنے کہ میں چھو سکتی تھی...... پھر اچانک رات کا تیسرا پہر ہو جاتا ہے ۔ مجھے یاد آتا ہے کہ یہیں میں عمر سے اک بار ملی تھی ۔اب بھی صدیوں سے یہیں کھڑی ہوں کمزور سے بلب کی زرد روشنی رات بھر اندھیروں سے لڑتی رہی ۔ مجھے یہ سمجھاتی رہی ۔

''مریم شاہ!

لڑ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔نصیب جس سیاہی سے لکھا جاتا ہے اسے مٹانے کے لئے ابھی تک کچھ ایجاد نہیں ہوا۔

پھر میں نے دیکھا صبح کی پَو پھٹنے لگی ہے ۔ میں اٹھی اور چل دی ۔اپنے گھر کے آنگن میں آ بیٹھتی ہوں ۔اور سوچتی ہوں...... کیا میں نے اپنی نارسائی سے سمجھوتہ کر لیا ہے ۔ جو دل اب روٹھا روٹھا سا ہے...... چاہتا ہے وہ جو نہیں ملا...... وہ پاس ہے ۔ دل میں آباد ہے پھر کیوں اس سے لڑنا...... ہم ایک ہی آسمان تلے...... ایک ہی ہوا میں سانس لیتے ہیں ۔ ہوا اُسے چھو کر میرے پاس آتی ہے ۔کیا یہ کم ہے کیا......؟

آم کے درخت پر بیٹھی چڑیاں اک شور برپا کرتی اِدھر اُدھر سے اڑیں تو میری آنکھ کھل گئی ۔ وہ سارا دن دانہ دنکا چگنے کے بعد اپنے نشیمن کی طرف لوٹ آئی تھیں ۔ یوں لگ رہا تھا۔ وہ لڑ رہی ہیں ۔ وہ ہر روز مغرب ہونے کو ہوتی بہت شور کرتیں ۔ آہستہ آہستہ شور تھم جاتا...... مغرب کی اذان ہوتے ہی سناٹا طاری ہو جاتا ۔

میں بھی وضو کرنے کو اٹھی ۔ سارا دن عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا ۔ رونق رہتی ۔حویلی میں زندگی بھاگتی دوڑتی مگر شام ہوتے ہی سناٹا راج کرنے لگتا ۔ بھاء جی نے تو شادی نہ کی صفدر بھائی کی بیگم انگلینڈ جا کر بس گئی کہ بچوں کو وہیں پڑھانا ہے ۔ وہ کئی مربعوں کی مالک تھی ۔اپنے صاحب حیثیت ہونے پر بہت اتراتی تھیں ۔ سال میں ایک بار آتی......صفدر بھائی بھی چکر لگاتے رہتے تھے ۔

مجھے یوں لگتا میری وجہ سے بھاء جی اور صفدر بھائی زندگی سے دور ہو گئے ہیں ۔اکلوتی بہن کا دکھ انہیں بہت تھا ۔ عین جوانی میں بیوگی ۔

میں نے خود کو پڑھنے اور عورتوں کے مسائل سننے اور حل کرنے تک ہی محدود کر لیا تھا ۔مغرب کے بعد ڈائری لکھتی اور عشاء کے بعد ذکر اذکار...... پھر سو جاتی ۔

رات کے تیسرے پہر مجھے عمر کا خواب جگا دیتا...... میں الجھ کر رہ جاتی...... میں خواب کیوں دیکھتی ہوں...... محبت ،عشق کا روپ

دھار چکی تھی...... یہ وہ منزل تھی جس میں پانے کی طلب نہیں رہتی......اندر ہی اندر ہی گیلی لکڑی کی طرح وجود کو سلگاتی ہے۔
عشق آ کاس بیل جیسا ہے۔جس تن سے چمٹتی ہے اس کے ساتھ اس مضبوطی سے چمٹتی ہے کہ توڑ کر ہی ٹوٹتی ہے۔ یہ خوبصورت نرم و نازک بیل دیکھنے میں کتنی خوبصورت ہوتی ہے مگر......جس درخت پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ مرجھانے لگتا ہے۔ یہ درخت کی سبز ٹہنیوں سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہے۔ بہت جلد بڑھتی ہے۔مگر درخت سوکھ جاتا ہے۔
عشق بھی جس تن کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔اسے نچاتا ہے۔ پاؤں میں گھنگھر و باندھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔عشق نچاتا ہے چھن......چھن......چھن گھنگھر و کی لَے عشق کے گیت پر اور تیز ہوتی ہے......من اضطراب کے بول لہک لہک کر گاتا ہے......عاشق مضطرب من کا چین پانے اِدھر سے اُدھر، یہاں سے وہاں بھاگتا ہے۔ بھاگتا چلا جاتا ہے۔دور بہت دور من چلے عشق کا گیت بجتا رہتا ہے......کبھی نہیں رُکتا، رُکتا ہے تو اس وقت...... جب دل کا رقص دھک دھک کی لَے پر رقص کرتا کرتا رک جاتا ہے۔عشق کی بیل ہری بھری......جوں کی توں......وجود جل کر سوکھ جاتا ہے۔ختم ہو جاتا ہے......عشق پھر کسی اور کی طرف چل پڑتا ہے ۔اسے تو زندہ رہنا ہے۔ وہ تو ازل سے ابد تلک ہے۔اسے تو رہنا ہے شاید تبھی......کسی ماں نے اپنی اولاد کے لئے عشق نہیں مانگا...... صحت، دولت عمر......سب مانگتی ہے مگر......عشق کی دھن......اپنے بچے کو سننے نہیں دیتی۔
عشق آ کاس بیل جیسا...... ہاں اب جان لیا عمر کا عشق بھی تو مجھے چمٹ گیا......میری رگ رگ سے خون چوس رہا ہے......مگر جان نہیں چھوڑتا......میری ہڈیوں میں اب درد رہنے لگا۔کبھی کبھی سینے میں بائیں طرف درد اٹھتا......مگر یہ درد بھی اب لذت دیتا......اذیت سہہ سہہ کر انسان اذیت پسند ہو جاتا ہے۔
مجھے موت کا لفظ بہت اچھا لگتا......میں سوچتی مرنے کے بعد کیسا سکون میرے وجود میں اترے گا۔میرا دل کیسی شانتی پائے گا۔

O......❖......O

ڈائری کے بہت سارے صفحات خالی تھے۔کوئی تحریر نہ تھی۔ایک ہفتہ بعد ڈائری پر لکھا تھا۔
''بھاء جی میری گرتی صحت سے بہت پریشان ہیں۔ وہ جب بھی کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کی بات کرتے ہیں میں ٹال دیتی ہوں...... مجھے پتہ ہے میرا مرض لاعلاج ہے۔میرے دل کی بندگلی سے نکلنے کا اب کوئی راستہ نہیں اس میں ایک بار عمر کی محبت ایسی داخل ہوئی......پھر کبھی واپسی کا رستہ نہ ملا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی، ہر رگ میں اُترتی......دل کی اتھاہ گہرائیوں میں براجمان ہے۔
باقی ڈائری خالی تھی لکھنے کی کوشش میں چند الفاظ ٹوٹے پھوٹے......نامکمل جملے......
چند صفحات پلٹنے کے بعد ایک تحریر تھی۔
وہ آئے گا......مگر تب...... جب مٹی، مٹی میں مل جائے گی......
مجھے پتہ ہے میرا خواب سچا ہے۔ جو میں ہر ماہ اماوس کی پہلی رات کے تیسرے پہر دیکھتی ہوں......جس میں عمر لوٹ آتا ہے۔ وہ حویلی کے دروازے کو پیٹ ڈالتا ہے......میرا پوچھتا ہے......کوئی اسے جواب دیتا ہے۔
''وہ تو چلی گئی......آج تیسرا دن ہے۔عمر سرخ ڈائری ہاتھ میں تھامے جاتا دکھائی دیتا ہے...... پھر دھند میں اس کا وجود دکھائی نہیں دیتا......
باقی ڈائری خالی تھی۔
گڑیا نے ڈائری بند کرتے الماری میں رکھ دی۔آپا جی کے انتقال کو تیسرا دن تھا۔حویلی کے سوگوار ماحول میں سناٹوں کا راج تھا۔

مغرب کی اذان ہونے کو تھی گڑیا کمرے سے نکل کر صحن میں آئی ۔شام نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے ہی تھے کہ بڑے دروازے پر زور کی دستک ہوئی ۔گڑیا کا دایاں ہاتھ صحن میں روشنی کرنے کے لئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھتا رُک گیا۔مُڑ کر حویلی کے دروازے کو دیکھا۔

الٰہی بخش نے گیٹ کھولا تو تھکا ماندہ اجنبی مسافر کھڑا تھا۔

گڑیا جان گئی......اجنبی کون تھا......آپا جی کے کمرے کی طرف مڑی۔وہ سرخ ڈائری لانے کے لئے......اسے ایک امانت اس اجنبی کو سونپنی تھی۔جس میں بندگلی کی کہانی تھی۔

❍......❖......❍

اوڑھنی

آج وہ میرے سرہانے بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ جسے میں نے دل و جان سے روح کی گہرائیوں سے چاہا۔ میں اسے کہتی چند پل میرے پاس بیٹھو کچھ میری سنو......اپنی سناؤ......

مگراس وقت تو وہ زندگی کی ہر بازی جیت رہا تھا۔میری سنتا ہی کب تھا۔میری محبت نے بھی اسے بہت مغرور بنا دیا تھا۔

کسی کا عاشق بننے میں کتنی راحت ہے۔

عاشق ہونا تو دل کو مضطرب ہی رکھتا ہے اور جب محبوب سنتا ہی نہ ہو۔

عورت بھی کتنی پاگل ہوتی ہے۔محبت کرنے سے بہت ڈرتی ہے اور جب کرتی ہے ٹوٹ کر کرتی ہے۔زندگی کا سفر طے کرنے والوں کے لیے محبت آسمانی تحفہ ہے۔جو دل میں اُتر کر پہلے مسرور......شاداں رکھتا ہے۔پھر ہجر کے شب و روز میں جلتا دل راکھ بننے لگتا ہے۔

مجھے پتہ ہی نہ چلا کب اس کی محبت میں میرے دل میں اُتری اور کب میں کشکول لے کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔اس نے میرا کشکول خالی ہی رہنے دیا۔ مجھے دیکھ کر فخر سے مسکرایا۔''میں ہوں ہی چاہے جانے کے قابل۔''

میں نے بہت سمجھایا۔ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔آج میں تم سے ملنے کو روتی ہوں۔وقت نے کروٹ لی تو تم بھی مجھے ڈھونڈتے پھرو گے۔مگر میں کہیں نہیں ملوں گی۔تمہیں یاد ہے۔ایک بار میں نے تمہیں پھول بھجوائے تھے۔تم نے وہ سب باہر پھینکوا دیئے۔کیونکہ تمہیں میرے پھولوں کی ضرورت نہ تھی۔تمہارا کمرہ تو اس دن رنگ برنگ پھولوں سے مہک رہا تھا۔میرے دیئے پھولوں کی وہاں جگہ نہ تھی۔

سال یونہی گزرتے رہے۔تمہاری محبت میرے دل کی بندگلی میں جو اُتری۔پھر واپسی کا رستہ ہی بھول گئی۔میں نارسائی کا کرب لیے جیتی رہی۔پھر پتہ چلا تم ملک سے باہر جا چکے ہو۔یہ سُن کر میرا دل دھڑک اٹھا۔اس شام میں بہت روئی۔کاش تم مجھے بتا کر جاتے۔مگر تمہاری زندگی میں میری کوئی جگہ نہ تھی۔ایک دن میں نے اپنے رب سے دعا مانگی۔تمہیں بھی خدا کسی طوفان سے آشنا کر دے۔تمہارا دل بھی میری طرف پلٹ آئے۔تم مجھے ڈھونڈو اور میں نہ ملوں۔

سنو!تم نہیں جانتے۔

تمہاری بے رخی مجھے جینے نہ دیتی تھی۔زہر بن کر میری رگ رگ میں سرایت کر گئی تھی۔میں بارہا سوچتی۔''تم میں آخر کیا ہے......؟ جو قرۃالعین کے دل کو بھا گیا۔''

میں پاگل سی ہو گئی تھی۔کبھی تم پر غصہ ہوتی۔خود کو ڈانٹتی۔تمہارے وجود کو خیال ہی خیال میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی۔مگر یہ نفرت

فوراً محبت میں بدل جاتی۔ دن میں کئی بار خود کو لعنت ملامت کرتی۔

میں نے ایک کتاب پڑھی۔ اس میں لکھا تھا۔

''محبت شفاف پاکیزہ دلوں میں بسیرا کرتی ہے۔

عشق کا روپ دھار کر دونوں دلوں پر یکساں اثر چھوڑتی ہے۔''

میں نے تمہاری آنکھوں میں کبھی محبت نہ دیکھی۔ جب بھی تم سے ملنے آئی۔ تمہارے دوست کہتے۔ ''تم جا چکے ہو۔''

میں ندامت میں گھری لوٹ آتی۔ اس دن تو تم نے حد کر دی۔ جس دن صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ میں کئی بار رو چکی تھی۔ تمہارا خیال میرے دل سے جدا ہی نہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا میں تمہیں دُور سے ہی دیکھ کر لوٹ آؤں گی۔ تم راستے میں ہی مل گئے میں نے بات کرنی چاہی تو تم نے مجھے جھڑک دیا۔

''مس قراۃ العین آپ میری جان نہیں چھوڑ سکتیں۔''

میں بُت بنی رہ گئی۔ میں یہ بھی نہ کہہ سکی دلوں پر تو خدا کو اختیار رہے۔

وہ جب چاہے۔ جس دل میں چاہے محبت اتار دے۔

میں نہ تو محبت کرنے پر قادر ہوں نہ نفرت کرنے پر۔

ہاں اتنا جانتی ہوں محبت دل میں اُتر کر وجود میں روشنی بھر دیتی ہے۔ خدا کی قدرت کا احساس ہوتا ہے۔

وہ جب کہتا ہے۔

اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔

بے شک دشواری کے ساتھ آسانی ہے۔

بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وہ سب جانتا ہے۔ سنتا ہے۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ میں نے سوچ لیا اب تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ وہ مالک چاہے گا تو میری محبت تیرے دل میں ڈال دے گا۔ ورنہ ان حالات سے وہ مجھے کیا سکھانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھوں گی۔ جاننے کی کوشش کروں گی۔

میں رات کو رو لیتی اور دن بھر اپنے مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرتی۔ تمہاری محبت نے مجھے اللہ کے بہت قریب کر دیا۔ میں جان گئی تھی۔

ہونی ہو کر رہتی ہے۔

میں نے اس محبت کا اپنے خدا کے سوا کسی کو علم نہ ہونے دیا۔ میں لحہ لحہ اندر سے مرنے لگی۔ ایک وقت آیا جب مجھے موت، موت نہ لگی۔ آخری گھڑی، آخری سانس لیتے ہوئے میرے دل سے دعا نکلی کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو جائے۔ تمہیں بھی میرے دل کے اضطراب کی خبر ہو......وہ دعا قبول ہو گئی۔

اور آج تم میرے پاس بیٹھے رو رہے ہو۔ آنسو جو مٹی میں گر کر جذب ہو رہے ہیں وہ مجھے شانت کر رہے ہیں۔ تم اتنے پھول لائے ہو کہ سارا شہرِ خموشاں مہک اٹھا ہے۔ پھول ہی پھول ہیں مٹی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ آج تمہارے پھولوں کی اوڑھنی اوڑھ کر میں بہت خوش ہوں۔

جاتے جاتے سنو!
میں کبھی ہوا کا جھونکا بن کر، تو کبھی خوشبو بن کر تمہیں چُھو کر گزر روں گی۔ تب تمہارے دل کو قرار مل جائے گا۔ تم میری خاطر مسلمان ہو گئے میں یہ سن کر جھوم اٹھی ہوں۔
اب تم جاؤ۔
مجھے اپنی محبت کی جیت کا جشن منانا ہے۔ مجھے یہ اوڑھنی اوڑھ کر سارے شہرِ خموشاں کو بتانا ہے۔
''تمہیں مجھ سے محبت ہے......!!!''

O......ختم شد......O